عبرت

(افسانے)

زنفر کھوکھر

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں

(افسانے)

مُصنّفہ: زنفر کھو کھر

عبرت

(افسانے)

مُصنّفہ: زنفر کھوکھر

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں

کتاب کانام	:	عبرت (افسانے)
مُصنّفہ	:	زنفر کھوکھر
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۰ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۵۵۰/روپے
ٹائٹل	:	مختار گرافکس، جموں
کمپوزنگ	:	کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں-۱
طباعت	:	رہبر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی-٦
ناشر	:	عاصمہ جرال کھوکھر
اہتمام	:	طاہر ندیم کھوکھر

" IB'RAT "

(SHORT STORIES)

WRITER : ZANFAR KHOKHAR

2010

PRICE : RS.550/-

COMPOSING AND LAYOUT

CRESCENT HOUSE PUBLICATIONS

267-JOGI GATE, JAMMU-180001.

JAMMU & KASHMIR STATE, INDIA

MB: 9419134617, 8803747617

تقسیم کار

خان بک سیلرز ساج، موضع ساج، راجوری، جے اینڈ کے-۱۸۵۲۱۲

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲٦۷-جوگی گیٹ، جموں-۱۸۰۰۰۱

ڈائمنڈ بک ہاؤس، پریم نگر، گوجر نگر روڈ، جموں-۱۸۰۰۰۱

اِنتساب

اپنے شوہرِ نامدار

محترم حنیف کھوکھر صاحب

کے نام!

جِن کے تعاون کے بغیر

میرا ادبی سفر

ناممکن ہے۔

زنفر کھوکھر

فہرست

نمبر شمار	عنوان		صفحہ نمبر
۱	دیباچہ	خالد حسین	9
۲.	زنفر کھوکھر کی افسانوی دُنیا	دیپک بُدکی	۱۶
۳.	ہم سب ایک ہیں		۲۷
۴.	اگلی کارروائی		۳۳
۵.	بے ایمان		۳۸
۶.	عبرت		۴۲
۷.	تین وارداتیں		۷۲
۸.	وہ کون تھا؟		۷۵
۹.	دو حکمران		۱۰۶
۱۰.	کمائی		۱۰۹
۱۱.	حرف آشنا		۱۱۴
۱۲.	اور منگنی ٹوٹ گئی		۱۱۹
۱۳.	اب کیا ہوگا؟		۱۲۵
۱۴.	چُوک		۱۳۱
۱۵.	کب تلک؟		۱۳۶
۱۶.	بلا عنوان		۱۴۰

——— خالد حسین

ایک افسانہ نگار کا دُوسرے افسانہ نگار کے تخلیقی عمل اور رُجحان پر لکھنا عجیب سا لگتا ہے اور اگر لکھنے والا آپ کا ہم عصر ہو تو اور بھی مشکل۔ اُس پر طُرّہ یہ کہ پیش لفظ یا دیباچہ لکھنے کے لئے فرمائش کی جائے۔ میری نظر میں ہر ایک افسانہ نگار کا اپنا ایک اِنفرادی مزاج اور اُسلوب ہوتا ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے اُس کی ایک الگ پہچان ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ایک کہانی کار اِس ضمن میں لکھے گا تو ضروری نہیں کہ وہ ایک نقاد کی طرح ہر پہلو کو ملحوظِ خاطر رکھے اور اُن تمام رموز کا احاطہ کرے جو کہانی کی بُنت میں اِستعمال ہوتے ہیں۔

افسانے کی صنف اٹھارویں صدی کی پیداوار ہے اور سب سے پہلے یہ صنف انگریزی ادب کا حصّہ بنی۔ پھر فرانسیسی، رُوسی اور دیگر عالمی اور مقامی زبانوں نے اِسے قبول کیا۔ ایشیا اور برِصغیر ہند میں گو حکایتوں، قصوں اور کہانیوں کی صورت میں نثر صدیوں سے موجود ہے، چاہے وہ کتھا سا گر اور پنچ تنتر کی کہانیاں ہوں، گلستان و بوستان کی سبق آموز حکایتیں ہوں، داستانِ امیر حمزہ ہو یا قصہ چار درویش ہو۔ یہ ساری نثر موجودہ کہانی کی اِبتدائی شکلیں ہی ہیں لیکن ادب میں ناول اور افسانے کی اصناف انگریزی ادب کی ہی دین ہیں۔ اُردو میں پہلا افسانہ راشد الخیری کا ''نصیر اور خدیجہ'' ہے جو ۱۹۰۳ء میں چھپا اور ناول ۱۸۹۷ء میں چھپا جو عبدالکریم نے لکھا اور عنوان تھا ''ریاض دلرُبا''۔ ناول کے برعکس افسانہ میں اِختصار سے کام لیا جاتا ہے اور کم سے کم الفاظ میں

زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نیز واقعاتی تاثر کو گہرا کرنے کے لئے کم سے کم کرداروں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ واقعات کے بجائے ایک واقعہ یا تاثر کو کہانی کا مرکزی نکتہ بنایا جاتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ افسانے میں کئی تجربے کئے گئے۔ روایتی افسانہ، ترقی پسند افسانہ، علامتی افسانہ، جدید افسانہ، مابعد جدید افسانہ اور تجریدی افسانہ وغیرہ۔ لیکن اِن تمام تجربات کے باوجود افسانہ وہی مقبول ہوا جو زِندگی کے قریب ہو اور سماجی اقدار اور معاشرے کی اِصلاح اور دیگر عوامل کو پیش کرنے کی سعی کرتا ہو۔ افسانہ نگار نہ تو واعظ ہوتا ہے اور نہ پند و نصیحت کرنے والا لیکن وہ اُن امور کی نشاندہی ضرور کرتا ہے جو معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جموں و کشمیر میں تخلیق ہونے والے افسانوں کا انداز اور مزاج مُلک کے دیگر علاقوں میں لکھے جا رہے افسانوں سے الگ ہے۔ مُلک کی تقسیم کے بعد ریاست کا سیاسی اور معاشی منظرنامہ ہمیشہ اِنتشار کا شکار رہا۔ یہاں حالات ہمیشہ دِگرگوں رہے ہیں۔ عوام کی رائے، اُن کی نفسیات، اُن کے حالات، تہذیب و تمدُّن غرض مکمل سماجی سنکٹ سے مرکز کی کٹھ پُتلی سرکاروں کی عدم توجہی، مسائل کو گُفت و شنید کے بجائے طاقت سے حل کرنے کا وطیرہ یا جوڑ توڑ اور لالچ سے قابض رہنے کی سبیلیں ڈُھونڈنا، ایسے معاملات ہیں جو عوام کے اندر بے چینی پھیلاتے رہے ہیں اور اِنہی اسباب کے تحت گزری صدی کے آخری دھاکے میں عوامی غم و غصہ اور بے چینی کا لاوا پھٹ پڑا، جس کا ہمسایہ مُلک نے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور نوجوان نسل کو گمراہ کیا۔ اِس عوامی تحریک کو دبانے کے لئے سرکاری دہشت گردی کے ردِعمل میں ملی ٹینسی یا آتنک واد پلیگ کی طرح پھیلا اور عوام پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اِس گھٹن اور کشاکش سے ریاستی ادیب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کے بیشتر افسانہ نویسوں نے اِنہی حالات و واقعات کو مرکز بنا کر اپنے تخلیقی عمل کا اِظہار کیا۔

محترمہ زنفر کھوکھر کا افسانہ بھی اِنہی حالات و واقعات کی عکاسی کرتا ہے اور

ایک حساس خاتون افسانہ نگار ہونے کے ناتے زنفر کھوکھر نے ایسے معاملات کو شدّت سے محسوس کیا اور ضبطِ تحریر میں لایا۔ زنفر کھوکھر کے دو افسانوی مجموعے ''خوابوں کے اُس پار'' اور ''کانچ کی سلاخ'' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ''عبرت'' اُن کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ ''ہند سماچار''، ''شاعر'' اور دیگر رسائل و جرائد میں مسلسل چھپتی رہتی ہیں۔ یعنی افسانہ لکھنا اُن کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہاں! اہم بات یہ ہے کہ ضلع راجوری کے ایک دُور افتادہ اور پسماندہ گاؤں 'ساج' میں رہ کر اپنے تخلیقی عمل کو جاری و ساری رکھنا' یہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔

جہاں تک محترمہ زنفر کھوکھر کے تخلیقی روّیے کا تعلق ہے تو اُن کے ہاں کسی خاص رُجحان کو تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ اُن کے ہاں ترقی پسندی' جدیدیت اور مابعد جدیدیت' تجریدی اور علامتی تجربات اور حوالہ جات کو تشخص کرنے کا عملی اظہار موجود نہیں ہے۔ البتہ اُن کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ اپنے قرب و جوار کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں اور آس پاس کے اُنہی عوامل اور مشاہدوں سے افسانہ کوکشید کرتی ہیں۔ جس بھی حادثہ یا واقعہ نے اُنہیں جھنجھوڑا اور متاثر کیا' اُنہوں نے اُسے افسانہ بنا دیا۔ جن گھٹناؤں کو زنفر کھوکھر نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے وہ گھٹنائیں ایک مضبوط بنیاد رکھتی ہیں اور حقیقت کے قریب ہیں۔ اس لئے اُن کی ادبی دیانتداری پر ذرا بھی شک کرنے کا جرم نہ تو افسانے کے ناقدین کر سکتے ہیں اور نہ ہی افسانے کے قارئین۔

''عبرت'' میں شامل افسانوں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ زنفر کھوکھر نے اپنے ذاتی تجربے اور واقعاتی نقشے کو قاری کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی کہانیاں سماج کے مختلف رنگوں کی آئینہ دار ہیں۔ دہشت گردی' بربریت' اغوا' بے چارگی' بے بسی' گھٹن' خوف' غُصہ 'لوٹ کھسوٹ' حراستی ہلاکتیں' ضمیر فروشی وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو زنفر کی گرفت میں آنے کے بعد افسانوں کے موضوع بن جاتے ہیں۔ سرحدی علاقوں

میں فوج، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور دیگر حفاظتی اداروں کی طرف سے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ، آگ زنی، املاک کی تباہی، قتل و غارت، فرضی جھڑپوں میں اِنسانی جانوں کا زیاں، اخوانی (جعلی ملی ٹنیٹ، جو فوج کی پناہ میں رہتے ہیں اور اُن کی ہدایت پر کارروائیاں کرتے ہیں) مجاہدوں کے ہاتھوں روزانہ کی ذِلّت ورُسوائی، عصمت دری اور دُوسری طرف ہمسایہ مُلک کی جانب سے آئے تربیت یافتہ ملی ٹینٹوں کا عوام پر مظالم ڈھانا، مجاہدوں کے بھیس میں نقلی دہشت گردوں اور غنڈہ عناصر کا غریب اور لاچار لوگوں کو تنگ کرنا، غرض عوام کا اِس دو دھاری دہشت گردی کا مسلسل شکار ہونا ایسا پس منظر ہے جس میں زنفر کھوکھر کے افسانوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ اِن موضوعات پر زنفر کھوکھر کے افسانے خون رُلاتے ہیں اور لگتا ہے اِس حسّاس خاتون افسانہ نویس نے لہو میں قلم ڈبو کر لکھا ہے۔

''اب کیا ہوگا''، ''کب تلک''، ''دستک''، ''دھماکہ''، ''وہ کون تھا''، ''دو حکمران'' افسانے کم وبیش اِنہی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ افسانہ ''اب کیا ہوگا'' دونوں ملکوں کے عوام، خصوصاً سرحدی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی اُمنگیں، آس اور اُمیدیں بندھنے اور ٹوٹنے کی کہانی ہے۔ بھارت اور پاکستان کے سربراہوں کی مُلاقاتیں اور پھر نشستن، گُفتن اور برخاستن۔ افسانہ ''دو حکمران'' دوطرفہ دہشت گردی سے مجبور اور بے بس عوام کے اِستحصال کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ کہانی ''وہ کون تھا'' اُن اخوانی ٹھگوں پر کڑا طنز ہے جو مجاہدوں کے بھیس میں عوام کو لوٹتے ہیں۔

اِن موضوعات کے علاوہ زنفر کھوکھر نے کئی دیگر موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ جیسے افسانہ ''ہم ایک ہیں'' میں سماج میں پھیلی بدعتوں کا ذِکر ہے۔ خصوصی طور پر رشوت ستانی کا، جس میں آج کا پورا معاشرہ مبتلا ہے۔ کہانی ''اگلی کارروائی'' میں ایک امیرزادہ ایک کم سن لڑکی کی عصمت دری کرتا ہے۔ قانون اور سزا سے بچنے کے لئے مقامی پنچایت اور معتبر لوگوں کے دباؤ میں آکر اُسی امیرزادے کے ساتھ اُس

لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے اور اس طرح یہ معاملہ حل کر لیا جاتا ہے لیکن وہ لڑکی امیر زادے سے اپنی رُسوائی کا بدلہ یوں لیتی ہے کہ سہاگ رات کو ہی اُس کا پوشیدہ عضو کاٹ کر اُسے قتل کر دیتی ہے۔ ''بے ایمان'' ایسا افسانہ ہے جس میں ایک رِشوت خور ملازم سخت احتیاط اور ہوشیاری برتنے کے باوجود سِٹنگ آپریشن میں پکڑا جاتا ہے۔

''کمائی'' میں ایک ایسے بوڑھے کا ذِکر ہے جو اپنی خود غرض اور لالچی اولاد کے ہاتھوں تنگ آ کر رات کو گھر سے بھاگ نکلتا ہے اور فوجیوں کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اولاد کے لئے ایک لاکھ روپے کے معاوضے کی رقم چھوڑ جاتا ہے۔

''حرفِ آشنا'' ایک ایسے نو وارد شاعر کی کہانی ہے جو ایک بزرگ، زِیرک اور علم شناس معلّم پر اپنی بھڑاس اِس لئے نکالتا ہے کیونکہ اُس نے نو وارد شاعر کے مجموعۂ کلام پر تقریظ لکھنے سے اِنکار کیا تھا۔ کہانی ''اور منگنی ٹوٹ گئی'' میں مناسب اور قابلِ صورت دُولہا دُلہن کا ہونا ضروری قرار پایا گیا ہے۔ سُرو قد مٹیار کے لئے ٹھگنے قد کا دُولہا ہرگز قبول نہیں ہے۔ ''بلا عنوان'' کہانی میں ایک اسّی سالہ بُڑھیا کا ذِکر ہے جسے صائمہ پناہ دیتی ہے۔ اِس کہانی میں لاوارث بڑھاپے کی بے بسی بیان کی گئی ہے۔ ''اِنتقامی'' ایک سنکی اور تُرش مزاج آدمی کی کہانی ہے جو پہلی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور اپنی غصیلی طبیعت کی وجہ سے ہر ایک سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ افسانہ ''خیرات'' میں اُن بھیک مانگنے والوں کا ذِکر ہے جو کئی بہانوں اور ترکیبوں سے اپنے آپ کو مستحق ثابت کرتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ اِسی طرح کہانی ''پوچھئے مت'' میں ایک مُنہ زور بیوی اور شریف النفس خاوند کی چپقلش کا اِظہار ہے۔ کہانی ''دستک'' بھی دہشت گردی اور سرکاری بربریت کے موضوع کا تسلسل ہے۔ ''راہ کا روڑا'' کہانی میں سرکاری و نیم سرکاری اور نجی اداروں میں ہونے والی رنجشوں، عداوتوں اور افسروں کی تانا شاہی کا بیان ہے۔

''دہشت کا سماں'' افسانے میں زنفر کھوکھر نے سسرال والوں کے لالچ اور کھلی بربریت کا ذِکر کیا ہے۔ بہو کو جہیز کے لئے تنگ کرنا اور پھر مار ڈالنا اور قتل کا الزام دہشت

گردوں پر ڈال دینا کہ سیما فوج کی مخبر تھی اور یوں ایک لاکھ کی رقم بھی سرکار سے وصولنا اِس کہانی کا پلاٹ ہے۔ ''جواز'' افسانے میں درجہ فہرست ذاتوں کے ایسے افراد کا بیان ہے جو خصوصی کوٹے کے ذریعے نوکریاں حاصل کر لیتے ہیں اور قابل اور زیادہ پڑھے لکھے افراد رہ جاتے ہیں۔ کہانی ''آہ'' ایک بوڑھے کی رُوداد ہے جو بیوی کے فوت ہونے کے بعد اولاد کے ہاتھوں پریشان ہے۔ ''وہ آئے تو سہی'' ایک بیوہ کی کہانی ہے جو ایک شادی شُدہ شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اُس سے شادی کر لیتی ہے اور پچھتاتی ہے۔

''عبرت'' کے افسانوں کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ زنفر کھوکھر کے ہاں بناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اُنہوں نے سماج کے اندر ہو رہی بے اِنصافیوں کو دیکھا ہے۔ زخم سے رستے ناسُور کی وہ عینی شاہد ہیں۔ زِندگی، موت، محبت، نفرت، دُکھ، سکھ، اُمید اور نا اُمیدی کا اُنہوں نے گہرا مشاہدہ کیا ہے اور جموں و کشمیر کے مقامی اور عصری حوالوں کے ساتھ انہیں اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔

افسانہ ''عبرت'' مولوی باسط علی کے گرد گھومتا ہے جو ایک بنیاد پرست اور سخت مزاج آدمی ہے۔ اُس کی بیٹی صبیحہ باپ کے طے شدہ رشتے کو ٹھکراتے ہوئے شادی سے اِنکار کر دیتی ہے اور بغاوت پر آمادہ ہو کر سُہیل کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے، جسے وہ چاہتی ہے۔ مولوی باسط اِس سازش میں اپنی بیوی کا ہاتھ دیکھتا ہے اور اُس کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ یہ حرکت مولوی کے بچوں کو ناگوار گزرتی ہے اور وہ سب گھر سے بھاگ کر ننھیال میں اپنی ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ مولوی باسط اپنے کئے پہ پچھتاتا ہے اور معززین کے سمجھانے پر بیوی کا حلالہ کروا کر اُسے دوبارہ اپنی منکوحہ بنالیتا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے معاشرہ پر ایک بھرپور طنز ہے۔

زنفر کھوکھر کے افسانے جموں و کشمیر کی سیاست، تاریخ اور سماجیات کا ایک منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور عام فہم ہیں۔

یوں تو لکھنا ایک شعوری عمل ہے لیکن لکھنے کی خواہش لاشعور میں پروان چڑھتی ہے اور الفاظ کے ذریعہ تخلیق بنتی ہے۔ ادیب کی فنی بصیرت تخلیق کو نکھارتی ہے اور یہ فنی بصیرت گہرے مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ تقاضا زنفر کھوکھر صاحبہ سے بھی کیا جاتا ہے کہ وہ اُردو کے کلاسیکی افسانے کو اپنے مطالعے میں شامل کریں۔ اِس کے علاوہ آج اُردو افسانہ کس مقام پر کھڑا ہے، دیگر زبانوں میں افسانے کی کیا صورتِ حال ہے، اِس کا بھی جائزہ ضرور لیں۔ میرے قریب زنفر کھوکھر ایک ذِمہ دار اور باشعور ادیبہ ہیں اور اُن میں اپنی کہانیوں کا احتساب آپ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ از خود ہی اِس امر کا جائزہ لے سکتی ہیں کہ اُن کے کون کون سے افسانوں کے عنوان موضوع سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ افسانے کا عنوان ہی تخلیق کے مجموعی تاثر کو بیان کرتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ سکتی ہیں کہ کس افسانے میں فنی چابکدستی کی کمی ہے اور کس افسانے کی پیش کاری میں اُن کی شبد شکتی نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ اِس بات پر تو یقیناً وہ ایمان رکھتی ہوں گی کہ کلاسیکی اور عالمی فکشن کا سنجیدہ مطالعہ کرنے سے بڑے بڑے اَسقام رفع ہو جاتے ہیں۔

زنفر کھوکھر ریاست جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کی ایسی نسائی آواز ہے جس کے تابناک مستقبل کے جملہ اِمکانات روشن ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ اُن اِمکانات کو یقینی بنانے کے لئے موصوفہ اُردو افسانے کے طویل تر سلسلوں سے اپنا رِشتہ اُستوار رکھیں گی اور قدما کے کارناموں سے مستفیض ہونے والوں کی پہلی صف میں اپنی جگہ بنانے کے لئے تگ و تاز کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔

○○○

زنفر کھوکھر کی افسانوی دُنیا

ـــــ دیپک بُدکی

''خوابوں کے اُس پار'' سے لے کر ''کانچ کی سلاخ'' تک زنفر کھوکھر نے اپنے ادبی سفر کے دوران کئی سنگِ میل طے کیے ہیں۔ زبان اور اُسلوب پر اُن کی گرفت اِبتدا سے ہی نظر آتی تھی۔ البتہ فکر و خیال میں پختگی اور بالیدگی وقت کے ساتھ ساتھ آتی گئی۔ اُن کے افسانوں میں رُومانیت اور مقصدیت دونوں موجود ہیں اور مجھے یہ کہنے میں بالکل تامّل نہیں کہ افسانہ اُن کی سرشت کا حصّہ بن کر رہ گیا ہے۔

زنفر کھوکھر ریاست جموں و کشمیر کے ایک دُور دراز پسماندہ علاقے ساج راجوری میں اُردو ادب کی شمع جلائے بیٹھی ہیں اور محکمہء تعلیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ علاقہ جہاں اپنی فطری خوبصورتی کے لئے مشہور ہے وہیں سرحد کے قریب ہونے کے سبب ہمیشہ لرزاں اور پُر فغاں رہتا ہے۔ تقسیمِ مُلک کے بعد اِس علاقے نے کسی بھی دِن امن و چین سے سانس نہیں لیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑائیوں کے دوران یہ دھرتی ٹینکوں اور گولہ بارود سے دہل اُٹھتی ہے۔ ہنستے کھیلتے گھر آنکھ جھپکتے ہی کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور لوگ راتوں رات اپنے گھر بار چھوڑ چھاڑ کر نقلِ مکانی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دھرتی کے اِس کرب کو زنفر نے نہایت ہی دقیقہ شناسی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اِس کے علاوہ ''عورت'' بھی موصوفہ کے افسانوں کا غالب موضوع رہا ہے۔ وہ عورت پر ہو رہے ظلم و ستم، ناخواندگی، جہیز اور عدم تحفظ پر اکثر فوکس کرتی ہیں۔ اِس کے باوجود وہ نہ تو تانیثی تحریک سے وابستگی کا

اِظہار کرتی ہیں اور نہ ہی تانیثی آزاد روی کے خواب دیکھتی ہیں۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں کا تیسرا اہم موضوع نظام تعلیم ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں اساتذہ اور تعلیم سے وابستہ منتظمین کو آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔

''خوابوں کے اُس پار'' زنفر کھوکھر کا پہلا مجموعہ ہے جس میں تیس افسانے شامل ہیں۔ حصّہ اوّل کے چودہ افسانوں کا رنگ مزاحیہ ہے جبکہ حصّہ دوم کے سولہ افسانوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں۔ اِن افسانوں کا جائزہ لیتے وقت مجھے اِس بات کا ہر دم احساس رہا کہ زنفر مشرقی عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں آزادی کے ساٹھ سالوں کے بعد بھی ماڈرن زِندگی کی رمق دکھائی نہیں دیتی۔ اِتنا ہی نہیں بلکہ اِس علاقے میں زِندگی کی بنیادی ضروریات جیسے بجلی اور پانی، ہسپتال اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج اور یونیورسٹیاں بھی نہیں ملتیں۔ افسانہ نگار نے اس محدود ماحول میں رہ کر بھی خوبصورت افسانے رقم کئے ہیں، جن میں اُن کے مشاہدے سے زیادہ اُن کے مطالعے کا عمل دخل ہے۔ ''خوابوں کے اُس پار'' پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور الدین لکھتے ہیں:

> ''یہ صحیح ہے کہ ابھی زنفر کھوکھر کی تحریر میں وہ مقناطیسیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کے بغیر فن کار کو حیاتِ دوام حاصل نہیں ہوتی لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اِس مقناطیسیت تک پہنچنے کے لئے جس بنیادی جوہر کی ہر فن کار کو ضرورت ہوتی ہے یعنی تخیل کی بے پایانی اور فکر کی جَولانی' یہ دونوں عناصر زنفر کے قلم کو قدرت نے کماحقہٗ عطا کئے ہیں۔''

مزاحیہ افسانوں میں زنفر کھوکھر نے عام زِندگی میں پیش آنے والے چھوٹے موٹے واقعات کے مزاحیہ پہلو اُبھارے ہیں اور ساتھ ہی اپنے علاقے کی پسماندگی، لاچارگی اور ضروریاتِ زندگی کی عدم موجودگی کو ہدفِ ملامت اور اپنی طنز کا نشانہ بنالیا ہے۔ افسانہ ''مدہوش'' میں وہ پبلک ٹرانسپورٹ کے پابندی سے نہ چلنے کے سبب ہمیشہ

آفس دیر سے پہنچ جاتی ہے اور ایک روز جلدی پہنچنے کے چکر میں خواب میں اغوا ہو جاتی ہے۔ ''گھر پیارا گھر'' میں نا کتخداؤں کو کرائے پر گھر نہ ملنے کے باعث اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کرتی ہے مگر یہ جھوٹ بھی کام نہیں آتا کیونکہ نئی مالک مکان شادی شدہ لوگوں کو اپنا گھر کرائے پر دینا پسند نہیں کرتی۔ ''اِنتخاب'' میں عورتوں کا تعاقب کرنے اور اُن سے بدسلوکی کرنے، ''ہم ہندوستانی ہیں'' میں حُب الوطنی، ''یوں بھی ہوتا ہے'' میں اسکول دیر سے پہنچنے، ''نصیحت'' میں سررشتۂ تعلیم کے اِنتظامیہ کے دوغلے رویے، ''جوابی کارروائی'' میں تعلیم یافتہ بیوی کے آگے اَن پڑھ تاجر کا احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر دُوسری شادی کرنے، ''ہمارے ماسٹر جی'' میں اُستاد طبقے کو اپنی ذِمہ داریاں سمجھنے، ''عزت کا سوال'' میں عورتوں پر ہو رہے مظالم کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اخباری رپورٹر کا مردوں پر ہو رہے ظلم کا چشم دید گواہ بننے، ''چکری'' میں ایک دیانتدار اُستاد کا خود کو سماج میں الگ تھلگ پانے، ''اہلیہ محترمہ'' میں آدمی کا شادی کر کے بیڑیوں میں بندھ جانے، ''پہلی ہی نظر میں'' میں باغی لڑکی کو اپنے عاشق کے ڈھونگ کا پتہ چلنے، ''گزشتہ راصلوٰۃ'' میں حاضری رجسٹر کے غائب ہو جانے اور پھر اپنے ہی کاغذوں میں مل جانے کے درمیانی وقفے میں ہیڈ ماسٹر کی حواس باختگی اور ''پرنسپل صاحب'' میں اِنتظامیہ کی جانب سے مردوں کو عورتوں پر ترجیح دینے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

''خوابوں کے اُس پار'' فکر انگیز افسانہ ہے جس میں ایک باپ شہوت کے زیرِ اثر اپنی ہونے والی بہو کو نہایت چالبازی کے ساتھ اپنی بیوی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ خونی رِشتوں کی شکست و ریخت پر لکھا گیا یہ بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے جس کو پڑھ کر مجھے سٹار ورلڈ کے ایک سیریئل ''بولڈ اینڈ دی بیوٹی فُل'' کی یاد آئی۔ اِس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شہوت پرستی اور اِشتعال انگیزی صرف مغربی تہذیب کی میراث نہیں ہے بلکہ مشرق میں بھی پردے کے پیچھے پروان چڑھتی رہی ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ مغربی تہذیب کی بدعنوانیاں غیر مشروط میڈیا اور ادب کے ذریعے

کُھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں جبکہ مشرقی تہذیب میں پل رہی گندگی دبیز تہوں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ وہ چاہے امرد پرستی ہو یا ترویج محرمات (Incest) 'ایذا رسانی ہو یا درز بینی (Voyeurism)۔ اِس افسانے میں احساسِ گناہ اور عدمِ تحفظ خود باپ کو آتشِ زیرِ پا رکھتا ہے مگر اُس کا فرمانبردار بیٹا رِشتوں کی لاج رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا جس کے باعث شکیل کی وفات کے بعد اُس کی نئی ماں یوں گویا ہوتی ہے:

> ''شکیل تم نے مجھے ماں کا رُتبہ دے کر میرے سارے خوف اور اندیشے دُور کر دیے تھے۔ تم نے میرے بچوں کو اپنے سگے بھائی کہہ کر مجھے مستقبل کی انجانی فکروں سے آزاد کر دیا تھا۔ شکیل ہمیں تمہاری ضرورت تھی۔''

دیگر افسانوں کے موضوعات بھی ہم عصری مسائل پر مبنی ہیں۔ افسانہ ''ایک چھوٹی سی لڑکی'' میں معشوقہ سے مراجعت، ''بے بسی'' میں نیچی ذات کی لڑکی سے شادی نہ کرنے کے سبب عمر بھر اُسے یاد کرنا، ''دردِ نہاں'' میں ایسی لڑکی سے اِنتہائی محبت کرنا جو شادی شدہ ہے، ''تشویش'' میں ایک دلیر لڑکی راحیلہ کا طلاق شدہ ثاقب کو سیکنڈ ہینڈ مرد کہہ کر ٹھکرا دینا، ''گھر'' میں نقلِ مکانی اور بے زمینی کا کرب، ''بڑی بہو'' میں عورت کو بانجھ ہونے کے سبب گھر سے نکال باہر کرنا، ''رعایت'' میں نسوانی آزادی اور ریزرویشن بل کی ضرورت، ''نسخہ'' میں متنازعہ موضوع کی آڑ میں قلمکاروں کا شہرت حاصل کرنا، ''وہ'' میں بچہ نہ ہونے کے باعث طلاق ہونا، ''دربہ'' (ڈربہ) میں گھر سے نکالے جانے پر نادرہ کا اپنے پُرانے بوسیدہ کمرے میں پناہ لینا، ''حُسنِ سلوک'' میں بہو کا اپنی ساس سے تنخواہ کی مانگ کرنا اور بدلے میں ساس کا اپنی ساری رقم اُس کے حوالے کر دینا، ''ایس.ٹی'' میں ریزرویشن کا مسئلہ، ''ایک اِنسان'' میں اِنسان کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اُس کا اصلی رُوپ سامنے لانا، ''پچھتاوا'' میں ایک معصوم لڑکی کو چھلاوے سے اپنے گونگے بہرے بھائی سے شادی کروانا اور ''اے جانِ ناتواں'' میں مردوں کی دُنیا میں عورتوں کی بے بسی و لاچاری —— غرض یہ کہ زنفر کھوکھر نے اپنے

گرد و پیش کو کھنگال کر ہی افسانے رقم کئے ہیں۔

زنفر کھوکھر کا دُوسرا مجموعہ بعنوان ''کانچ کی سلاخ'' چار سال کے وقفے کے بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔ اِس مجموعے کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ زنفر نے ادبی میدان میں ایک لمبی چھلانگ لگا کر منزل کو پانے کی کوشش کی ہے۔ زبان، اُسلوب اور ٹریٹمنٹ، سبھی پہلوؤں میں فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ مشاہدے میں گہرائی، مطالعے میں وُسعت اور موضوعات میں سنجیدگی صاف نظر آتی ہے۔ حالانکہ اِس مجموعے میں سترہ سنجیدہ افسانوں کے علاوہ نو مزاحیہ افسانے بھی شاملِ اشاعت ہیں مگر اِن افسانوں میں بھی عصری مسائل کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں میں زنفر کھوکھر کو اپنی رائے دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مزاحیہ واردات، واقعات یا لطیفے افسانے نہیں بن سکتے۔ افسانے میں سنجیدہ فکر و خیال کا ہونا لازمی ہے۔ بذلہ سنجی افسانے کی منزل نہیں بن سکتی، صرف منزل تک پہنچنے کے لئے مدد کر سکتی ہے۔ کرشن چندر نے نہ تو اپنے افسانوں کو لطیفہ بنانے کی کوشش کی اور نہ ہی مزاحیہ خاکہ۔ اِس کے برعکس اُنہوں نے طنز کے تیروں سے معاشرے پر بھرپور وار کئے اور یہی اُن کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ افسانہ نگار کو چاہیے کہ وہ مزاحیہ خاکوں اور مضامین کو الگ سے شائع کروائیں۔

''کانچ کی سلاخ'' کے دیباچے میں امین بنجارا یوں رقم طراز ہیں:

''زنفر کھوکھر نے اپنے گرد و پیش میں رُونما ہونے والے واقعات وحادثات کا اثر قبول کر کے اور اچھے بُرے لمحوں کے کھیل تماشوں کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے اِنسانی فطرت کے رموز و اسرار کی گرہوں کو کھولنے کی جو سعی کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اصل میں لمحوں کے کھیل تماشے ہی اُن موضوعات کو جنم دیتے ہیں جن پر فن کار اپنے فن کی بنیاد رکھتا ہے — زنفر کھوکھر اِس بات کی قائل نہیں ہیں کہ انسان رنج و غم کے حصار میں مقید ہو کر رہ جائے

یا پھر کسی بھی مسئلے کو اپنی جان کا روگ بنالے۔ وہ پَل پَل ٹوٹنے
اور بکھرنے کے بجائے خوشحال، پُرسکون اور آزاد فضاؤں میں
سانس لینے کو ترجیح دینے کا پیغام دیتی ہیں، بھلے ہی اِس عمل کے
دوران میں جگ ہنسائی اور طعن و تشنیع سے دو چار ہونا پڑے۔ یہ
زنفر کے فن کا رجائی پہلو ہے۔ قنوطیت اور یاسیت سے اُنہوں
نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔''

مذکورہ کتاب کا پہلا افسانہ ''سیکنڈ ہینڈ'' پہلے مجموعے میں بھی شامل ہے۔
افسانہ ''خواب'' کی زاہدہ بیگم بچوں کی بے اِنتہا لالچ اور خود غرضی دیکھ کر اپنی دولت
غریبوں میں بانٹتی ہے۔ ''کانچ کی سلاخ'' نفسیاتی افسانہ ہے اور لگتا ہے اِس کا ہیرو
نواز علی کہیں نہ کہیں افسانہ نگار سے ملا ہے۔ اِس افسانے میں فوجی ڈِسپلن کا گرویدہ نواز
علی اپنے گھر میں بھی ڈِسپلن کا خواہاں ہے مگر اپنی بیوی صدیقہ جان کو قابو کرنے میں
ناکام ہوتا ہے۔ وہ جتنی بھی پابندیاں لگانے کی کوشش کرتا ہے، صدیقہ اُتنی ہی بپھر جاتی
ہے۔ اِس گھریلو تنازعے سے فائدہ اُٹھا کر اُن کا بیٹا بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے اور
ملی ٹنینٹ بن کر حب الوطن اور نیک سیرت نواز علی کے مُنہ پر کالک پوت کر اُسے راہِ عدم
اِختیار کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ افسانہ ''حادثہ'' میں ماں کی ممتا کے باعث اُس
کا بیٹا بگڑ جاتا ہے اور دونوں کے درمیان خلا نمودار ہوتا ہے۔ ''یہ دُنیا اگر مل بھی جائے تو
کیا ہے'' میں ڈرپوک بیٹا ماں باپ کے کہنے پر محبوبہ سے کنارہ کر کے دُوسری لڑکی سے
شادی تو کر لیتا ہے مگر لاشعور میں اُسی کو بسائے رکھتا ہے۔ ''خاموشی'' کہانی ہے ایک
بانجھ عورت کی جو اُٹھتے بیٹھتے اپنی جیٹھانیوں کے طعنے سنتی رہتی ہے اور ایذا پسند عورت
کی طرح اپنے آپ کو یوں تسلی دیتی ہے ''وہ کیا جانیں کہ قدرت نے ستم سہنے میں بھی
ایک مزا چھپا رکھا ہے۔'' اِسی طرح ''یادیں'' نفسیاتی اُلجھن میں پھنسی مامی عذرا کی
کہانی ہے جو شوہر کی بے توجہی کے سبب چھ بچے جَن کر بھی ہر ایرے غیرے کو اپنے

دُکھڑے سناتی رہتی ہے اور آخر کار اپنے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے۔

زنفر نے دیہاتی لوگوں کی معصومیت اور سادگی کو افسانہ ''پانچ سو روپے'' میں بڑی خوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ اِس افسانے میں ڈاکٹر ایک دیسی عورت کی سادگی اور ناخواندگی کا فائدہ اٹھا کر اُس سے ایک سو روپے کے بجائے پانچ سو روپے اینٹھ لیتی ہے اور ساتھ ہی ناک چڑھا کر گویا ہوتی ہے۔ ''تم دیہاتی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہو، کام نکلوانے کے بعد ذلالت پر اُتر آتی ہو۔ میں تم دیہاتیوں کو بہتر طور پر جانتی ہوں۔'' ''مجبوری'' سماجی بدعتوں پر لکھا ہوا خوبصورت افسانہ ہے۔ راوی پڑوسی کی بیٹی کی شادی پر فضول خرچیوں کے لئے روپیہ دینے سے اِنکار کرتی ہے مگر وقتِ ضرورت اُسی پڑوسی کی بہو، جو حاملہ ہوتی ہے، کی جان دو ہزار روپے دے کر بچاتی ہے۔ ''پارٹنرشپ'' میں لیاقت علی ایک تنک مزاج لڑکی سے لو میرج کرتا ہے مگر بعد میں اُس سے چھٹکارا چاہتا ہے جس کے لئے اُس کا بزنس پارٹنر اُس کی مدد کرتا ہے۔ ''کچھ نہیں'' میں خوش مزاج نازیہ کو اُس کے والدین کم پڑھے لکھے بے روزگار مرد کے پلّے باندھ دیتے ہیں مگر وہ اپنے شوہر کی کمزوریوں کے بدلے اُس کی خوبیوں کے سہارے زِندگی جی لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ''بندھن'' کہانی ہے ایک بیوہ کی جو اپنے مرے ہوئے شوہر کو اِتنا چاہتی ہے کہ دُوسری شادی کے تصور ہی سے ذہنی اختلال کا شکار ہو جاتی ہے۔ ''بھول بھلیاں'' میں سمدھی ایک دُوسرے سے سچائی چھپاتے ہیں اور سارا قصور شادی کروانے والے کے سر منڈھتے ہیں۔ ''انجام'' ایسا افسانہ ہے جس میں ایک لڑکی کے گھر چھوڑ کر اپنے عاشق کے ساتھ بھاگنے سے گھر کی تباہی کی منظر کشی کی گئی ہے جبکہ افسانہ ''فیصلہ'' کثیر الازدواجی زِندگی کی صعوبتوں پر لکھا گیا ہے۔ ''سمجھوتہ'' میں اپنے باپ، خاوند اور بیٹے سے دھوکہ کھا کر سعدیہ اکیلی زِندگی سے لڑتی ہے۔ ''تلقین'' میں فریدہ اپنی امی کی خرابیٔ صحت کی خبر پا کر پہنچنے کے لئے ایک اجنبی سے لفٹ لینے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے اور آبرو بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔

مزاحیہ کہانیوں میں ''بائیں پچھواڑوں کی'' میں گھر کے مکینوں کو رات بھر ملی ٹینٹوں کا کھٹکا رہتا ہے جب کہ صبح وہ دروازے پر کُتے کو دیکھتے ہیں۔ ''خود کردہ را چارہ نیست'' اُن بوڑھے قلمکاروں پر طنز ہے جو اپنی تحریروں کے ساتھ جوانی کی تصویریں چسپاں کرتے ہیں۔ ''سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا'' اُن عاشقوں پر طنز ہے جو ہر اُس لڑکی کو معشوق سمجھ بیٹھتے ہیں جو اُن کے ساتھ ہنس کر بات کرتی ہیں مگر آخرش بھائی بناتی ہے۔ ''آس کا دامن'' کالی صورت مگر اُجلی سیرت والے آدمی کی کہانی ہے کہ آخر کار اُس کی بیوی کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ ''دراصل کچھ لوگ اندر سے نہایت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔''

''صندوق'' میں ایک حکایت کو افسانہ بنایا گیا ہے۔ افسانے میں ایک بوڑھا آدمی اپنے ٹرنک میں بڑا سا تالا لگا کر رکھتا ہے اور گھر کے سبھی فرد اُس ٹرنک کی وجہ سے اُس کی خوب خاطرداری کرتے ہیں جب کہ اُس ٹرنک میں کوئی قیمتی شے نہیں ہوتی۔ مزاحیہ افسانوں میں جو بہترین افسانہ رقم کیا گیا ہے وہ ہے ''حکم نامہ''۔ اِس افسانے میں ملی ٹینٹوں کے لیڈر حکم نامہ جاری کرتے ہیں جس کی رُو سے ہر عورت کو برقعہ پہننا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ راوی کو اِس بات کی حیرت ہوتی ہے کہ رات بھر میں ہی ہر دُکان پر برقعے دستیاب کیسے ہوتے ہیں۔ وہ سوچتی ہے کہ اِس میں اُن لیڈروں اور تاجروں کی کوئی سازش تو نہیں ہے۔ ''ریزرویشن'' میں نسوانی آبادی کے لئے ریزرویشن کی ضرورت، ''خواب نہیں دیکھا کرو'' میں خواب دیکھنے کی حماقت اور ''گالی'' میں کلام کی حُسن کاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔

زنفر کھوکھر اپنے افسانوں کی شروعات بڑے ہی دِلکش انداز میں کرتی ہیں۔ پہلے ہی جملے سے قاری افسانہ پڑھنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ اِس ضمن میں دو افسانوں سے اِقتباسات یہاں پر درج کر رہا ہوں:

''سیما ایک بوجھ تھی مجھ پر' ایک ناپسندیدہ بوجھ' جسے اُٹھائے رکھنا

میری مجبوری تھی۔ میری گھریلو اور خاندانی مجبوری اور پھر سماجی مجبوری۔ چونکہ میں منحرف نہیں تھا، روایات شکن نہیں تھا۔ سماجی قواعد و ضوابط اور رسم و رواج کا قدر دان تھا۔"

(یہ دُنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے.....)

"میرے یہ پوچھنے پر کہ آپ کے 'وہ' کیا ہیں....؟" نازیہ صاحبہ نے سر اُٹھا کر "کچھ نہیں" اِس انداز سے کہا جیسے کہہ رہی ہوں کہ 'وہ' سب کچھ ہیں۔ سی. ایم. ہیں بلکہ پی. ایم. صاحب ہیں......."

(کچھ نہیں)

کردار نگاری میں بھی زنفر یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے آس پاس کے ماحول سے ہی کردار ڈھونڈ نکالے ہیں۔ کئی افسانے تو ایسے ہیں کہ اُن کی اپنی زِندگی سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ اِس بارے میں امین بنجارا فرماتے ہیں:

"کردار نگاری کے حوالے سے زنفر کھوکھر کے افسانے بڑے جاندار ہیں کیونکہ اُن کے کردار اپنی اپنی ذات کے ٹوٹنے اور اپنی ذات کے کرب کی نمائندگی کرتے ہوئے قاری کو کبھی کبھار اپنے سینے پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ قاری کو کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زنفر کھوکھر نے اُس کے دِل و ذہن میں جھانک کر ہی یہ کردار صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے۔ صائمہ، نواز علی، صدیقہ جان، نازیہ، زاہدہ بیگم، ثاقب، بڑی بیگم، شاہنواز، لیاقت علی، بی اماں، راشد اور چھوٹی بیگم کے کردار ہمارے دیکھے ہوئے کردار ہیں جو خارجی اور داخلی سطح پر اپنا کرب اُبھارتے چلے آتے ہیں۔"

کئی افسانوں میں زبان کی غلطیاں در آئی ہیں۔ البتہ یہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ مثلاً صفحہ ۶۰ پر ہتیاچار (اتیاچار)، صفحہ ۱۲۱ پر پچھلی کھڑکی (پچھلا دروازہ)،

صفحہ ۱۴۱ پر اچٹکتی (اچٹتی)، صفحہ ۱۵۵ پر مزاح (مذاق) اور صفحہ ۱۵۷ پر دربے (ڈربے) ہونا چاہیے۔ اِن اغلاط کا تعلق مجموعہ ''خوابوں کے اُس پار'' سے ہے۔ ''کانچ کی سلاخ'' میں صرف دوتین غلطیاں نظر آتی ہیں، جیسے نظر ہو چکے (نذر ہو چکے) صفحہ ۹۰ وغیرہ۔ اِن اغلاط سے قطع نظر زنفر کھوکھر کی تحریریں قاری کو باندھنے میں کامیاب ہوتی ہیں اور عبارت کی دِلکشی شروع سے اِختتام تک برقرار رہتی ہے۔

سرحد کے قریب رہنے کی وجہ سے زنفر کی تحریروں میں بے گھری اور بے زمینی کا کرب جا بجا ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے چند اِقتباسات:

''اُس کی پھیکی سی ہنسی بے وجہ کب تھی۔ ابھی ابھی تو اُسے پتہ چلا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اُس کی طرح کوئی اور بھی ہے کہ مکان بنانے میں جس کے زیورات تک بک گئے ہیں۔ نہ جانے اور بھی کتنے ہوں گے......... بلکہ سب ہی ہیں۔ مکان یوں نہیں بن جاتے ہیں۔ مکان بنانے میں عمر لگتی ہے اور عمر بھر کی پونجی لگتی ہے۔ تب کہیں جا کر ہنستے بستے گھر وجود میں آتے ہیں۔'' آہ ہم لُٹ گئے۔ ہم تباہ و برباد ہو گئے۔ ہمارے ہنستے بستے گھر آناً فاناً ویران ہو گئے........'' اب آوازیں ہی آوازیں تھیں اور موضوع ایک تھا۔'' (گھر۔ صفحہ: ۱۳۵)

''بیٹی! دونوں جنگوں میں ہمارے بھرے پُرے گھر جلا دئے گئے اور تمہیں بتاؤں کہ جلائے کس نے.........! آہ! اپنے ہی ملک کی فوجوں نے محض اِس شک پر کہ اِن گھروں میں دُشمن کی فوجوں نے پناہ لے رکھی ہے۔ ہمارے پاس کشادہ مکان تھا۔ زِندگی آرام سے گزر رہی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا غدر پھوٹ پڑا اور ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا۔ ہم سات سال تک مہاجر بنے رہے۔

وطن کی کشش ہمیں واپس کھینچ لائی مگر ہم نے آکر کیا دیکھا ہمارے
گھر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ہم نے پھر دِن دیکھا نہ رات
اور پھر سے مکان بنایا۔ ابھی سکھ کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ سال
۱۹۶۵ء آگیا اور ہم پھر سے اجڑ گئے۔" (گھر۔ صفحہ: ۱۳۵)

"بہو ہم لوگ ہندو پاک کی جنگوں کے مارے ہوئے ہیں۔
ہمارے مکان دوبار جلائے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں بھی اور ۱۹۶۵ء
میں بھی۔ ہندوستانی فوجیوں نے اِس لئے جلائے کہ اِن گھروں
میں پاکستانی فوجیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا اور پاکستانی فوجیوں
نے اِس لئے جلائے کہ یہ ہندوستانیوں کے گھر تھے۔" (گھر)

محولہ بالا اِقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کو ہمیشہ عدمِ تحفظ، اپنی دھرتی اور اپنی مٹی کا کھو جانا اور زِندگی کا عبوری پن ستاتا رہتا ہے، جس کے باعث اُن کا نفسیاتی ردِ عمل بھی دُوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ زنفر نے اپنے کرداروں کے ذریعے اِس نفسیاتی کرب کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

آخر میں زنفر کھوکھر کے افسانوں کے بارے میں جگن ناتھ آزاد کی رائے پیش کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں:

"زنفر کھوکھر صوبہ جموں کی ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہیں
کہانیوں کی بُنت کا فن آتا ہے۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں میں
محسوسات اور احساسات کے کئی پرَتو دکھائی دیتے ہیں، جو اِس امر
کو واضح کرتے ہیں کہ وہ زِندگی کے ہر ایک پہلو پر گہری نگاہ
رکھے ہوئے ہیں اور زِندگی سے وابستہ گوناگوں مسائل پر غور وفکر
کرتا ہوا ذہن اُن کے پاس موجود ہے۔"

○○○

ہم سب ایک ہیں

فیملی پلاننگ کے منصوبوں سے اِتفاقِ رائے رکھنے کے باوجود بیگم دولت کے ہاں پانچ اولادیں ہوئیں۔ رشوت، نیاز، سوغات، تحفہ اور کمیشن۔ خوبی یہ رہی کہ یہ اولادیں جی کا جنجال نہیں بنیں بلکہ سبھی کام کاجی چلتے پرزے اور مصروفیت کے عالم میں........ یوں پانچوں کی پانچوں اُنگلیاں گھی میں۔ بیگم دولت کو بڑا ناز تھا اِن پانچوں پر۔ یہ اُس کی حکمت عملی تھی کہ اُس نے اِن پانچوں کے لئے الگ الگ راہیں منتخب کیں اور پانچوں کو الگ الگ راہوں پر گامزن کر دیا۔ عرصہ دراز سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا مگر بدقسمتی سے ایک روز ہوا یوں کہ رِشوت ذرا سی لاپروائی برتنے سے رنگے ہاتھوں پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بے تحاشہ چیخی چلائی ''ارے بدبختو! چھوڑو مجھے۔ مجرموں کو تو تم پکڑنے سے رہے، بس میں صنفِ نازک ہی تمہارے ہاتھ آئی۔ کچھ تو شرم کرو خبیثو۔ جنہیں پکڑنا ہوتا ہے اُنہیں تم راہِ فرار مہیا کرتے ہو اور کچھ کو تو تم پکڑ کر بھی چھوڑ دیتے ہو۔ میں صنفِ نازک پہلے سے ہی ہر طرح کی پابندیوں میں گھری ہوں۔ اُلٹا اب تم نے مجھے پکڑ بھی لیا ہے۔ میں کہتی ہوں چھوڑو مجھے۔''

مگر اُس کی ایک نہ چلی اور پولیس اُسے اپنے ساتھ لے چلی۔ تھکن اور ندامت سے رِشوت پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ راستے میں ایک جگہ اُس نے کہا ''میری زنجیر کھول دو اور ہاتھ سے بے شک پکڑ لو۔'' پولیس کا رشوت کو ہاتھ سے پکڑنا ہی تھا کہ اُس نے اُن کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور جُل دے کر بھاگ کھڑی ہوئی مگر آسمان سے گرا

کھجور میں اٹکا کے مصداق، دوڑتی بھاگتی، چھپتی چھپاتی رِشوت پھر سے کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور لوگ اُسے پکڑ کر ایک پیر صاحب کے پاس جا پہنچے اور اُس کے خلاف شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اِسے ہم اپنی بہادری سے پکڑ لائے ہیں۔ یہ اب گھر گھر جانے لگی ہے اور شریف لوگوں کے ایمان پر بھی ڈورے ڈالنے لگی ہے۔

پیر صاحب اُس وقت اپنے عقیدت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے جن میں کچھ بڑے بڑے عہدیدار تھے، وزیر تھے اور دیگر کئی اثر و رسوخ والے اور بڑے بڑے آفیسر بھی شامل تھے۔ پیر صاحب نے گرج کر پوچھا۔

''کیوں بی رشوت۔ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ اِس سے پہلے کہ لوگوں کے ایمان کمزور کرنے کے جرم میں تمہارے خلاف کارروائی شروع کی جائے اور سزا کے طور پر تمہیں تعزیر لگائی جائے، کیا اپنی صفائی میں تم کچھ بول سکتی ہو؟''

رِشوت نے حسبِ معمول ہار نہ مانتے ہوئے پیر صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا ''حضرت! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ چوری اور سینہ زوری! میں اِن دونوں کا بار اُٹھانے کے قابل کہاں۔ اِس لئے سب سچ سچ بتاتی ہوں۔'' سبھی متوجہ ہو گئے اور رِشوت نے نہایت مؤدب انداز میں کہنا شروع کیا۔

''حضرت! نیاز آپ کے یہاں پہنچتی ہے۔ تحفہ بڑے بڑے عہدیداروں کے ہاں جاتا ہے۔ سوغات بڑے لوگوں کے ہاں جاتی ہے۔ کمیشن بڑے بڑے آفیسروں کے ہاں آتا جاتا ہے اور میری پہنچ میں بس شریف اور سیدھے سادھے لوگ ہی رہ جاتے ہیں، جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ میں اُن کی مدد کرتی ہوں۔ اُن کے گھر کا چولہا ہانڈی گرم کرتی ہوں۔ میرا اپنا حلقۂ احباب ہے۔ میں کسی ایرے غیرے کے ہاں ہرگز نہیں جاتی ہوں اور جہاں بھی آتی جاتی ہوں، ایمانداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی ہوں اور کسی کو دھوکا نہیں دیتی ہوں۔ آئندہ میں کبھی کسی کی پکڑ میں نہیں آؤں گی۔ بس اِس بار مجھے معاف کر دیا جائے۔''

رِشوت کی یہ صاف گوئی تھی یا پھر اُس کا سُریلا لہجہ۔ پیر صاحب نے اُسے ڈانٹ ڈپٹ ضرور کی مگر سزا دینے سے درگزر کیا۔ اِتفاق سے اس نشست میں نیاز، سوغات، تحفہ اور کمیشن بھی موجود تھے۔ اُن کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ وہ ایک دُوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے۔

''دیکھو تو رِشوت میں کتنا دم ہے.......! سب کے سامنے ہم سب کے نام بھی گن کر گئی ہے مگر یہ اُس نے اچھا نہیں کیا۔ ہم پر بھی پابندی لگوانا چاہتی ہے یہ۔ بیچاری آئے دِن پکڑی جاتی ہے اور گھر میں دیکھو تو اپنے بڑے پنے کا رعب دِکھلاتی رہتی ہے۔''

''ہائے بیچاری رِشوت۔'' وہ رِشوت کو کوستے ہی گئے۔

حقِ وراثت کو لے کر بیگم دولت کے گھر میں پہلے سے ہی اِختلافات چل رہے تھے۔ رِشوت کے اِس طرح پکڑے جانے پر سب کے ہاتھ ایک نیا موضوع لگ گیا تھا۔ سب مل کر رِشوت کا ناک میں دم کرتے۔

''ہائے بیچاری رشوت۔ ہائے بیچاری۔''

مگر رشوت کسی کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ اِس لئے برداشت کرتی جا رہی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے ''اِن اللہ مع الصابرین'' کا وِرد کرتی۔ مگر کہاں تک؟ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

ایک روز اُس نے بھی مقابلہ آرائی کے لئے کمر کس ڈالی۔ یوں پانچوں میں جم کر لڑائی ہوئی۔ رِشوت نے اپنی وکالت آپ کرتے ہوئے کہا ''میں تم سے بڑی ہوں، زِندگی کے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ تجر بہ کار ہوں۔ بڑوں بڑوں کو میرا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کسی کو اندر تو کسی کو باہر لاتی ہوں۔ فٹافٹ کام نپٹاتی ہوں۔ کسی کو عرش سے فرش، تو کسی کو فرش سے عرش دکھلاتی ہوں۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالوں، کر کے ہی دِکھلاتی ہوں۔ نہیں تو پیچھا نہیں چھوڑتی ہوں۔ مرنے کے بعد بھی۔''

کھجور میں اٹکا کے مصداق، دوڑتی بھاگتی، چھپتی چھپاتی رِشوت پھر سے کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور لوگ اُسے پکڑ کر ایک پیر صاحب کے پاس جا پہنچے اور اُس کے خلاف شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اِسے ہم اپنی بہادری سے پکڑ لائے ہیں۔ یہ اب گھر گھر جانے لگی ہے اور شریف لوگوں کے ایمان پر بھی ڈورے ڈالنے لگی ہے۔

پیر صاحب اُس وقت اپنے عقیدت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے جن میں کچھ بڑے بڑے عہدیدار تھے، وزیر تھے اور دیگر کئی اثر ورسوخ والے اور بڑے بڑے آفیسر بھی شامل تھے۔ پیر صاحب نے گرج کر پوچھا۔

''کیوں بی رشوت۔ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ اِس سے پہلے کہ لوگوں کے ایمان کمزور کرنے کے جرم میں تمہارے خلاف کارروائی شروع کی جائے اور سزا کے طور پر تمہیں تعزیر لگائی جائے، کیا اپنی صفائی میں تم کچھ بول سکتی ہو؟''

رِشوت نے حسبِ معمول ہار نہ مانتے ہوئے پیر صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا ''حضرت! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ چوری اور سینہ زوری! میں اِن دونوں کا بار اُٹھانے کے قابل کہاں۔ اِس لئے سب سچ سچ بتاتی ہوں۔'' سبھی متوجہ ہو گئے اور رِشوت نے نہایت مؤدب انداز میں کہنا شروع کیا۔

''حضرت! نیاز آپ کے یہاں پہنچتی ہے۔ تحفہ بڑے بڑے عہدیداروں کے ہاں جاتا ہے۔ سوغات بڑے لوگوں کے ہاں جاتی ہے۔ کمیشن بڑے بڑے آفیسروں کے ہاں آتا جاتا ہے اور میری پہنچ میں بس شریف اور سیدھے سادھے لوگ ہی رہ جاتے ہیں، جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ میں اُن کی مدد کرتی ہوں۔ اُن کے گھر کا چولہا ہانڈی گرم کرتی ہوں۔ میرا اپنا حلقۂ احباب ہے۔ میں کسی ایرے غیرے کے ہاں ہرگز نہیں جاتی ہوں اور جہاں بھی آتی جاتی ہوں، ایمانداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی ہوں اور کسی کو دھوکا نہیں دیتی ہوں۔ آئندہ میں کبھی کسی کی پکڑ میں نہیں آؤں گی۔ بس اِس بار مجھے معاف کر دیا جائے۔''

رِشوت کی یہ صاف گوئی تھی یا پھر اُس کا سُریلا لہجہ۔ پیر صاحب نے اُسے ڈانٹ ڈپٹ ضرور کی مگر سزا دینے سے درگزر کیا۔ اِتفاق سے اس نشست میں نیاز، سوغات، تحفہ اور کمیشن بھی موجود تھے۔ اُن کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ وہ ایک دُوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے۔

''دیکھو تو رِشوت میں کتنا دم ہے.......! سب کے سامنے ہم سب کے نام بھی گن کر گئی ہے مگر یہ اُس نے اچھا نہیں کیا۔ ہم پر بھی پابندی لگوانا چاہتی ہے یہ۔ بیچاری آئے دِن پکڑی جاتی ہے اور گھر میں دیکھو تو اپنے بڑے پنے کا رعب دِکھلاتی رہتی ہے۔''

''ہائے بیچاری رِشوت۔'' وہ رِشوت کو کوستے ہی گئے۔

حقِ وراثت کو لے کر بیگم دولت کے گھر میں پہلے سے ہی اِختلافات چل رہے تھے۔ رِشوت کے اِس طرح پکڑے جانے پر سب کے ہاتھ ایک نیا موضوع لگ گیا تھا۔ سب مل کر رِشوت کا ناک میں دم کرتے۔

''ہائے بیچاری رشوت۔ ہائے بیچاری۔''

مگر رشوت کسی کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ اِس لئے برداشت کرتی جا رہی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے ''اِن اللہ مع الصابرین'' کا وِرد کرتی۔ مگر کہاں تک؟ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

ایک روز اُس نے بھی مقابلہ آرائی کے لئے کمر کس ڈالی۔ یوں پانچوں میں جم کر لڑائی ہوئی۔ رِشوت نے اپنی وکالت آپ کرتے ہوئے کہا ''میں تم سے بڑی ہوں، زِندگی کے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ تجربہ کار ہوں۔ بڑوں بڑوں کو میرا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کسی کو اندر تو کسی کو باہر لاتی ہوں۔ فٹافٹ کام نپٹاتی ہوں۔ کسی کو عرش سے فرش، تو کسی کو فرش سے عرش دکھلاتی ہوں۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالوں، کر کے ہی دِکھلاتی ہوں۔ نہیں تو پیچھا نہیں چھوڑتی ہوں۔ مرنے کے بعد بھی۔''

تحفے نے سر اُٹھا کر کہا ''بہن! یہی تو تم میں برائی ہے، چرچا میں آجاتی ہو۔''

''چپ رہ گول مٹولے۔ یہ برائی نہیں۔ شہرت ہے شہرت۔ آج کل لوگوں کا مزاج بدل چکا ہے۔ کل تک لباس عورت کی زینت تھا، آج عریانی اور نمائش عورت کی زینت ہے۔ مگر تو کیا جانے گول مٹولے!''

رِشوت دانت پیستے ہوئے کڑکی تو تحفے کو سر گھٹنوں میں دیتے ہی بنی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے رِشوت نے کہا ''میں بگڑی بات بناتی ہوں سب کے کام آتی ہوں۔ سرکاری دفتروں میں دھڑلے سے آتی جاتی ہوں۔''

تحفے نے پھر ذرا سا سر اُٹھایا اور کہا ''لیکن تم پر قانونی پابندیاں ہیں۔ اِس لئے میں کہتا ہوں نچلی ہو کے بیٹھ جاؤ۔ نہیں تو پھر پکڑی جاؤ گی۔'' مگر رشوت کو خود پر بڑا بھروسہ تھا۔ اُس نے زور دے کر کہا ''میں چاہوں تو قانون کے پرخچے اُڑا دوں۔ میری طاقت سے قانونی زنجیریں ہی نہیں سرحدیں تک کھل جاتی ہیں اور تم یہ مت بھولو کہ مجھے پکڑنے والا بھی میری پکڑ سے کبھی بچ نہیں پایا ہے۔''

سوغات لہجے میں قدرے مٹھاس بھر کر بولی ''بہن تم مانو یا نہ مانو، مگر سچ تو یہ ہے کہ تم بہت بدنام ہو چکی ہو۔ بھروسے کے لائق نہیں ہو۔ اِدھر سے آتی ہو تو اُدھر سے نکل جاتی ہو۔ جبکہ میں معتبر ہوں۔ عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہوں۔''

رِشوت نے گھور کر سوغات کو دیکھا اور بولی ''تم نے مجھے نیتا سمجھ رکھا ہے شاید۔ یہ اِلزامات تمہیں اُن نیتاؤں کو دینے چاہئیں جو بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ جو وعدے کرتے ہیں، نبھاتے نہیں ہیں۔ ووٹ ایک پارٹی کے نام پر لیتے ہیں گھس پیٹھ دُوسری میں کرتے ہیں۔''

اُدھر سے کمیشن نے ایک ساتھ کئی وار کر دیئے۔ ''تم چھپتی چھپاتی ہو۔ راتوں کو چلتی ہو۔ محفلوں و انجمنوں سے ڈرتی ہو۔ اِشاروں کنایوں میں بات کرتی ہو۔ تمہیں منہ لگانے سے ہر کوئی ڈرتا ہے۔''

رشوت جل بھن کر بولی ''خاک پابندی ہے مجھ پر۔ کسی دِن دیکھو میرے ساتھ دفتر چل کر۔ میں سرکاری دفتروں میں دھڑلے سے آتی جاتی ہوں۔ فائلوں کی گرد جھاڑتی ہوں۔ رُکے کام نکالتی ہوں۔ ممکن کو ناممکن اور ناممکن کو ممکن بناتی ہوں۔ ارے موٹے تازے کمیشن، تم تو صرف موٹے تازے لوگوں کے ہی کام آتے ہو نا، جبکہ میں ہر کسی کے کام آتی ہوں۔''

مگر کمیشن کب ہار ماننے والا تھا اکڑ کر بولا۔

''مجھے اپنے آپ پر ناز ہے۔ میں تمہاری طرح پابندیوں میں نہیں جکڑا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ سرکاری لائسنس یافتہ ہوں۔ بڑے بڑوں سے میرا رِشتہ ناتا رہتا ہے۔ دھڑلے سے چلتا پھرتا ہوں۔ منہ نہیں چھپاتا ہوں۔''

کمیشن کی شہ پاکر تحفہ بھی گڑگڑا اُٹھا۔ ''میں بھی کچھ کم نہیں ہوں۔ دُوریاں گھٹاتا ہوں، فاصلے مٹاتا ہوں، قربتیں بڑھاتا ہوں، سب کا پیارا اور راج دُلارا ہوں۔ میں کہیں بھی جاؤں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ ہر گھر میں میری پذیرائی ہوتی ہے۔''

رِشوت کڑک کر بولی ''گول مٹولے! تم بس نام سے ہی اچھے ہو۔ ذرا سوچو تو کچھ دم بھی ہے تمہارے اندر۔ جہاں جاتے ہو، آسانی سے ہضم کر لئے جاتے ہو مگر میں اِس ہاتھ دیتی ہوں تو اُس ہاتھ لیتی بھی ہوں۔''

نیاز تو خود کو میٹھا میوہ کہلوانے سے باز ہی نہیں رہتی تھی۔ کہتی تھی میں مزاروں پر چڑھتی ہوں، آسمانوں کی سیر کرتی ہوں۔ وہ بولی ''میں نہایت ہی باعزت ہوں۔ صد احترام سے پیش کی جاتی ہوں۔ میں سب کی جھولیاں بھرتی ہوں۔ کسی کو خالی ہاتھ نہیں لٹاتی ہوں۔'' رِشوت سر جھکا کر اُس سے مخاطب ہوئی ''بہن! تم لائقِ صد احترام ہو۔ میں تمہیں سلام کرتی ہوں۔ یہ اچھا ہی ہے کہ تم آسمانوں میں پرواز کرتی ہو۔''

سوغات سے اور کوئی بات نہیں بنی تو وہ بولی۔ ''بہن تم بہت زبان دراز ہو۔''

رِشوت چڑ کر بولی۔ ''لگتا ہے تمہارے پاس کہنے کو کوئی بات ہی نہیں رہ گئی

ہے۔ جلی کٹی اور گالی گلوچ پر وہ لوگ آتے ہیں جو دلائل کے ساتھ بات کرنا نہیں جانتے۔ خود کو معتبر مانتی ہو تو بات بھی معتبرانہ ڈھنگ سے کرو۔''

بحث و تکرار میں رِشوت کسی کو آگے بڑھنے ہی نہیں دے رہی تھی اور بیگم دولت بے خبر سوئی پڑی تھی۔ شور شرابے سے اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی اولاد نے گھر میں اُدھم مچا رکھا ہے۔ وہ بے حد مغموم ہوئی اور لگی پیار سے سمجھانے ''میرے بچّو! مجھے تم سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی کہ تم ایک ہی ماں کی اولاد ہو کر آپس میں لڑ پڑو گے۔ تم ایک جُٹ رہ کر ایک دُوسرے کے کام آنا سیکھو.....'' مگر اُس کی لاڈلی اولاد نے اُس کی باتوں کا ذرا بھی نوٹس نہیں لیا۔ تب وہ ڈانٹ ڈپٹ سے سمجھانے لگی۔ ''بیوقوفو! دُنیا تمہارے دم سے چلتی ہے۔ ساری رونقیں، سارے ہنگامے اور سارے رِشتے ناتے تمہارے دم سے ہیں اور تم ہو کہ لڑ جھگڑ کر میرا ناک میں دم کئے جا رہے ہو۔'' مگر بیگم دولت کی نصیحت کا اُن پر رائی برابر بھی اثر نہ ہوا اور وہ بحث و تکرار کی منزلوں سے گزر کر ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ تب بیگم دولت زور سے چیخی۔

''میرے بچو! آپس میں مت لڑو۔ اپنے اِختلافات کو اِس قدر طول مت دو کہ امریکہ کو دخل اندازی کرنے کا جواز ہاتھ لگ جائے۔''

نہ جانے بیگم دولت کی اِس ہانک میں کیسی طاقت تھی کہ وہ ایک دم سے چُپ ہو گئے اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد ایک جُٹ ہو کر گنگنا اُٹھے۔ ''ہم سب ایک ہیں، رُوپ رنگ انیک سہی، ہم سب ایک ہیں۔ ہم سب ایک ہیں۔''

○○○

اگلی کارروائی

اِمتحان میں اوّل آنے کی خوشی میں وہ تیزی سے گھر کی طرف لپکی، امّاں کو خوش خبری سُنانے! ''اوّل آنے والوں کو وظیفہ بھی ملے گا۔'' ماسٹر جی نے کہا تھا۔'' اب امّاں مجھے کیونکر اگلی کلاس میں داخل نہیں کرائے گی۔ آج کل ہائی اسکول تک پڑھنے سے نوکری تھوڑی ہی ملتی ہے۔ میں بہت آگے تک پڑھوں گی۔ آج کل نوکریوں کے لئے میرٹ دیکھا جاتا ہے۔ میں اگلی کلاسوں میں بھی فرسٹ آؤں گی۔ نوکری حاصل کروں گی۔ امّاں کی ساری پریشانیاں اور فکریں دُور کروں گی۔ شادی ہرگز نہیں کروں گی۔'' امّاں کہے گی ''سب ہی تو اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں۔'' میں کہوں گی '' کیا فرق پڑ جائے گا اگر دُنیا کی کوئی ایک لڑکی شادی نہیں بھی کرے تو! کیا دُنیا میں لوگ کم پڑ جائیں گے؟''

اِنہی خیالوں میں سرشار وہ اپنے گھر کی طرف جانے والی چڑھائی چڑھ رہی تھی کہ پیچھے سے اُسے کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنی رفتار قدرے کم کی اور راستے سے ایک قدم باہر ہوگئی تاکہ پیچھے سے آنے والا آگے نکل جائے۔ خوشی کے عالم میں ایک گیت کے بول اُس کے دِل کو اور بھی گدگدا اُٹھے۔ وہ دِل ہی دِل میں گُنگنا اُٹھی ....

پنچھی بنوں اُڑتی پھروں مست گگن میں
آج میں آزاد ہوں دُنیا کے چمن میں

اور اگلے ہی لمحے وہ پیچھے سے کسی آنے والے کی مضبوط گرفت میں جکڑ کر رہ

ہے۔ جلی کٹی اور گالی گلوچ پر وہ لوگ آتے ہیں جو دلائل کے ساتھ بات کرنا نہیں جانتے۔ خود کو معتبر مانتی ہو تو بات بھی معتبرانہ ڈھنگ سے کرو۔"

بحث و تکرار میں رِشوت کسی کو آگے بڑھنے ہی نہیں دے رہی تھی اور بیگم دولت بے خبر سوئی پڑی تھی۔ شور شرابے سے اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی اولاد نے گھر میں اُدھم مچا رکھا ہے۔ وہ بے حد مغموم ہوئی اور لگی پیار سے سمجھانے "میرے بچّو! مجھے تم سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی کہ تم ایک ہی ماں کی اولاد ہو کر آپس میں لڑ پڑو گے۔ تم ایک جُٹ رہ کر ایک دُوسرے کے کام آنا سیکھو....." مگر اُس کی لاڈلی اولاد نے اُس کی باتوں کا ذرا بھی نوٹس نہیں لیا۔ تب وہ ڈانٹ ڈپٹ سے سمجھانے لگی۔ "بیوقوفو! دُنیا تمہارے دم سے چلتی ہے۔ ساری رونقیں، سارے ہنگامے اور سارے رِشتے ناتے تمہارے دم سے ہیں اور تم ہو کہ لڑ جھگڑ کر میرا ناک میں دم کئے جا رہے ہو۔" مگر بیگم دولت کی نصیحت کا اُن پر رائی برابر بھی اثر نہ ہوا اور وہ بحث و تکرار کی منزلوں سے گزر کر ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ تب بیگم دولت زور سے چیخی۔

"میرے بچو! آپس میں مت لڑو۔ اپنے اِختلافات کو اِس قدر طول مت دو کہ امریکہ کو دخل اندازی کرنے کا جواز ہاتھ لگ جائے۔"

نہ جانے بیگم دولت کی اِس ہانک میں کیسی طاقت تھی کہ وہ ایک دم سے چُپ ہو گئے اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد ایک جُٹ ہو کر گنگنا اُٹھے۔ "ہم سب ایک ہیں، رُوپ رنگ انیک سہی، ہم سب ایک ہیں۔ ہم سب ایک ہیں۔"

ooo

اگلی کارروائی

اِمتحان میں اوّل آنے کی خوشی میں وہ تیزی سے گھر کی طرف لپکی، امّاں کو خوش خبری سُنانے! ''اوّل آنے والوں کو وظیفہ بھی ملے گا۔'' ماسٹر جی نے کہا تھا۔ ''اب امّاں مجھے کیونکر اگلی کلاس میں داخل نہیں کرائے گی۔ آج کل ہائی اسکول تک پڑھنے سے نوکری تھوڑی ہی ملتی ہے۔ میں بہت آگے تک پڑھوں گی۔ آج کل نوکریوں کے لئے میرٹ دیکھا جاتا ہے۔ میں اگلی کلاسوں میں بھی فرسٹ آؤں گی۔ نوکری حاصل کروں گی۔ امّاں کی ساری پریشانیاں اور فکریں دُور کروں گی۔ شادی ہرگز نہیں کروں گی۔'' امّاں کہے گی ''سب ہی تو اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں۔'' میں کہوں گی ''کیا فرق پڑ جائے گا اگر دُنیا کی کوئی ایک لڑکی شادی نہیں بھی کرے تو! کیا دُنیا میں لوگ کم پڑ جائیں گے؟''

اِنہی خیالوں میں سرشار وہ اپنے گھر کی طرف جانے والی چڑھائی چڑھ رہی تھی کہ پیچھے سے اُسے کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنی رفتار قدرے کم کی اور راستے سے ایک قدم باہر ہوگئی تاکہ پیچھے سے آنے والا آگے نکل جائے۔ خوشی کے عالم میں ایک گیت کے بول اُس کے دِل کو اور بھی گدگدا اُٹھے۔ وہ دِل ہی دِل میں گنگنا اُٹھی.........

پنچھی بنوں اُڑتی پھروں مست گگن میں
آج میں آزاد ہوں دُنیا کے چمن میں

اور اگلے ہی لمحے وہ پیچھے سے کسی آنے والے کی مضبوط گرفت میں جکڑ کر رہ

گئی۔ یکبارگی ایک ہاتھ اُس کے منہ پر اِس طاقت سے پڑا کہ اُس کی سانس بھی بند ہو گئی اور دُوسرا اُس کی کمر میں۔ کوئی اُسے اُٹھاتا اور گھسیٹتا ہوا راستے سے کچھ دُور ایک اوجھل اور گہری جگہ پر لے گیا اور اُس پر منوں بوجھ کی طرح بھاری پڑ گیا تھا۔ اب وہ اُسے دیکھ تو سکتی تھی مگر تڑپ تڑپ کر بھی خود کو اُس کے چنگل سے چھڑا نہ سکی۔

اور جب کچھ دیر تک اُسے شدید اذیت اور گھٹن سے دوچار کر لینے کے بعد وہ ظالم وہاں سے بھاگ نکلا تو وہ اپنے آپ کو سمیٹتی ہوئی، ہانپتی، کانپتی اور پچھتاتی ہوئی پھر سے گھر کی طرف لپکی، امّاں کو سُنانے!

''ہائے! وہ کس مصیبت سے دوچار ہو گئی دِن دہاڑے! وہ تو اسکول میں گزٹ سے اپنا رزلٹ دیکھنے گئی تھی!'' وہ بے آنسو رو پڑی۔

گھر پہنچتے ہی امّاں کے سامنے وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''امّاں! نورے کے حرامی نے مجھے مار ڈالا ہے۔ میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ امّاں جس طرح بھی ہو سکے اُس سے بدلہ لو۔ اُسے کاٹ ڈالو!''

اُس کے گھر میں ماں اور تین چھوٹے بہن بھائیوں کے سِوا اور تھا ہی کون! بیٹی کے غم میں ماں بھی دھاڑیں مار کر رو پڑی اور پھر چیختی چلاّتی ہوئی نورے کے گھر کی طرف چل پڑی۔ وہاں رو پیٹ کر گھر آئی اور بیٹی کو ساتھ لے کر رپورٹ لکھوانے کے لئے تھانے کی طرف چل دی۔ کچھ ہی پلوں میں سارے گاؤں کو خبر ہو گئی تھی۔

تھانے میں بڑا آفیسر موجود نہیں تھا۔ چھوٹے نے نام لکھے اور اگلے روز پھر آنے کو کہا۔ دُوسرے روز جب ماں بیٹی پھر تھانے پہنچیں تو بڑے آفیسر نے پوچھا ''اِس واقعہ کا کوئی گواہ ہے؟'' جواب نفی میں تھا مگر وہاں پر موجود ایک پولیس والے نے کہا ''جناب! گواہ جرور (ضرور) ہوگا۔ یہ عورتیں پہلے دوستی گانٹھتی ہیں۔ جب کوئی دیکھ لے تو شکایت لے کر آ جاتی ہیں کہ جبردستی (زبردستی) ہو گئی۔'' پولیس آفیسر نے اُس کی بات کو اہمیت نہیں دی اور کہا ''ثبوت کے لئے تمہیں ڈاکٹری جانچ سے گزرنا ہوگا اور

ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ساتھ لانا ہوگا' جب ہی کارروائی ممکن ہوگی۔''

اگلے روز ماں اور بیٹی شہر کے بڑے ہسپتال کے لئے نکل چل پڑیں۔ علاقے کا پولیس سٹیشن مغربی سمت میں تھا اور ہسپتال وہاں سے چالیس کلومیٹر دور مشرقی جانب تھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹری جانچ اور سرٹیفکیٹ لینے میں دو تین دِن اور لگ گئے۔

کچھ ندامت اور تذلیل سے' تو کچھ چار پانچ دِن کی مسلسل دوڑ دھوپ سے ماں بیٹی بے بس اور لاغر جان ہو چکی تھیں۔ اِسی بیچ گاؤں کے سرپنچوں اور معتبر لوگوں نے اس سنگین مسئلے کا ایک آسان حل ڈھونڈ لیا تھا۔

اگلے روز جب ماں پولیس تھانے کے لئے نکلی تو گاؤں کے سرپنچ نے اُس کو روک لیا۔ ''عورتوں کا تھانے کچہری جانا اچھا نہیں ہے۔ گاؤں کی بات گاؤں میں ہی سلجھ جائے تو اچھا ہے اور تم جانتی ہو کہ نورے کا ایک ہی بیٹا ہے اور نورا تمہاری بیٹی کو بہو بنانے کو تیار ہے اور ساتھ ہی عزت کا ہرجانہ دینے کے لئے بھی۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ نورے کے بیٹے کو سزا دِلوانے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ اُسے کچھ ہوگا ہی نہیں کیونکہ پیسہ چلتا ہے اور پیسہ سارے ثبوت مٹا دیتا ہے۔ یوں مجرم باعزت بری ہو جاتا ہے۔''

یہ فیصلہ ماں اور بیٹی' دونوں میں سے کسی کو بھی منظور نہیں تھا۔ جس اذیت اور ندامت سے وہ گزری تھی' اُس کی سزا بس یہی تھی کہ ملزم کو سنگسار کر دیا جائے' اُسے سولی پر لٹکا دیا جائے یا پھر یہ کہ وہ خود زہر کھا کر مر جائے مگر گاؤں کے اِنصاف پسند سرپنچ اور معتبر لوگ اُسی ظالم کے ساتھ اُس کی شادی رچا رہے تھے۔ وہ دوہری اذیت سے دوچار ہو گئی۔

سرپنچوں اور معتبروں نے چند روز اور سوچنے کے لئے دیئے۔ اِسی بیچ گٹھ جوڑ اور سمجھانے بجھانے کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک پنچ زوردار آواز میں اُس کی ماں سے کہہ رہا تھا ''تم بیٹی کو تھانے لے جا کر آپ اپنی عزت اُچھال رہی ہو۔ وہ پیسے دے کر

صاف بچ جائے گا اور پھر تمہاری بیٹی کو اور کون بیاہنے آئے گا؟ ہم اُسے ایک طرح کی سزا ہی تو دے رہے ہیں۔ ایک ایسی سزا اور عبرت کہ آج کے بعد کوئی دُوسرا بھی ایسا غلط کام نہیں کرے گا اور جو کرے گا اُسے اِسی طرح بھگتنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔''

''اُف......! گاؤں کے یہ معتبر کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ یہ کیسا فیصلہ کر کے ہم پر احسان جتلا رہے ہیں۔ یہ دوہری سزا مجھے مل رہی ہے یا اُس ظالم خبیث کو؟'' وہ سوچ سوچ کر لہولہان ہوئی جا رہی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ رہی تھی، بکھر رہی تھی۔

ایک اور برادری دار نے آ کر سمجھایا ''پنچایت کا فیصلہ ماننے میں ہی بھلائی ہے۔ آگے کے لئے پنچایت ذِمہ دار ہوگی۔''

وہ تو بدلہ لینا چاہتی تھی اور بدلہ بس یہی تھا کہ ملزم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے اُسے سنگسار کیا جائے۔ یہ اُس کا اپنا فیصلہ تھا مگر فیصلہ تو قانون کو کرنا تھا۔ فیصلہ تو پنچایت کو کرنا تھا۔ بڑوں کے فیصلے چھوٹوں کو ماننے ہی پڑتے ہیں۔ وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی اور پھر سوچوں کے اِس سلسلے میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔ ایک مکمل ٹھہراؤ۔ اُس نے ایک نظر اماں کو دیکھا۔ چہرے کی سیاہی اور جھریوں میں بہت اِضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک فیصلہ کُن انداز میں اماں سے بولی ''اماں میں تیار ہوں۔ آپ ہاں کہہ دو۔''

ایک سادہ سی، بے جان سی شادی کی رسم نبھائی گئی۔ وہ دُلہن بنی اور نورے کی اِکلوتی بہو کے طور پر اُس کے گھر پہنچ گئی۔ سب پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ایک سنگین مسئلے کا ایک بہترین حل مل گیا تھا۔ صلاح نامے اور نکاح نامے کے کاغذات تھانے پہنچا دیئے گئے تھے کہ گاؤں کا مسئلہ گاؤں میں ہی حل ہو گیا ہے۔

جس کو سزا دِلوانا چاہتی تھی، اب وہ خود اُس کے گلے کا ہار بن گئی تھی۔ اُسے زینت بخشنے، اُس کی سیوا کرنے اور اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے!

رات کے آخری پہر نورے کے گھر والے دِلخراش چیخیں سُن کر اُس کمرے کی طرف لپکے جہاں رات کو دُولہا اور دُلہن کو سُلایا گیا تھا اور دروازہ پیٹنے لگے۔ ''بھئی

دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو!'' مگر دونوں میں سے جب کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا تو اُسے توڑا گیا۔ اندر کا منظر دِل دہلا دینے والا تھا۔ دُولہا سر سے پاؤں تک خون میں لت پت پڑا تھا۔ اُس کی ناک کٹی ہوئی تھی اور زیرِ ناف بھی —— اور دُلہن غائب تھی۔ وہ پچھلی کھڑکی کے راستے بھاگ نکلی تھی' اپنی امّاں کو خبر سُنانے! کچھ دیر بعد وہ اپنی امّاں کے سامنے کھڑی تھی۔ اب وہ دھاڑیں مار مار کر رو نہیں رہی تھی۔ نورے کے بیٹے کی زیادتی کی شکایت نہیں کر رہی تھی بلکہ ایک اعتماد کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

''امّاں! میں نے اپنی تذلیل اور اذیت کا بدلہ لے لیا ہے۔ آگے کے لئے پنچایت ذِمہ دار ہوگی۔''

ooo

بے ایمان

"یہ کیمرہ ہے کہ شیطان؟"

اِنتہائی ندامت، غصے اور اِنتقامی حالت میں یہ جملہ اُس کے دل سے اُبھرا اور نوکِ زبان پر ایک سوال بن کر اٹک گیا۔ وہاں اُس کو جواب دینے والا کوئی نہیں تھا اور نہ ہی جواب کے لئے اُس نے یہ سوال اُٹھایا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ یہ سوال تھا ہی نہیں۔ یہ ایک جھنجھلاہٹ تھی۔ ایک اِنتقامی گالی تھی اور اِنتہائی اِضطراری کیفیت کے عالم میں زبان پر آنے والا ایک جملہ تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اپنے اندر سے ہی اُسے اِس کا جواب بھی مل گیا۔

حالانکہ شروع سے ہی سارے معاملات نہایت چابکدستی، ایمانداری اور رازداری سے طے پائے تھے۔ اِس خیال سے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، ہر ممکن تدبیر اختیار کی گئی تھی۔

اُس نے پہلے سے ہی عرضی گذار کو واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

"یہ سامنے کی بات ہے کہ میں تمہیں اپنی جیب سے کچھ نہیں دے رہا ہوں، مگر اپنے ہاتھوں سے تمہیں وہ دینے جا رہا ہوں کہ صرف تم ہی نہیں بلکہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی فیض یاب ہوتی رہیں گی۔ تمہارے فائدے اور نقصان کا اِس وقت میں واحد ذریعہ ہوں اور اگر میں تمہاری فائل پر مثبت ریمارکس کے بجائے منفی ریمارکس لکھ دُوں تو تم میرا بگاڑ بھی کچھ نہیں سکتے ہو، اُلٹا تمہیں نقصان ہوگا۔ اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے غداری، چالاکی اور بدنامی کا کوئی کھیل نہیں کھیلو گے۔"

عرضی گذار اُس کے پیروں میں جھک آیا۔

''جناب مجھے صرف اور صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ غداری اور چالاکی سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ یقین جانئے۔''

''تو بس ٹھیک ہے۔ ایمانداری ہی سب سے بڑی بات ہے۔''

پھر ایک دِن عرضی گذار اُس کے ٹیبل پر جھکتے ہوئے پھسپھسایا ''جناب! میں لے آیا ہوں۔''

''کہاں ہیں؟'' جواب میں اِس نے پوچھا۔ ''جیب میں ہیں۔ میں نکالوں۔'' عرضی گذار نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ آنکھیں دِکھا کر غرایا۔ ''بھاگ جا یہاں سے!'' عرضی گذار پل بھر کو ہکا بکا رہ گیا۔

وہ اپنے رجسٹر پر جھکے ہوئے مزید سخت مگر دھیمے لہجے میں بولا ''تم نادان شخص خواہ مخواہ ہی مجھے پھنسانے جا رہے ہو۔ جانتے نہیں ہو کہ آج کل سرکار اپنے ملازموں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے اور ہر طرح کی سختی برت رہی ہے اور میں اِس وقت اپنے سرکاری دفتر میں ہوں۔ یہاں بیسیوں لوگ اور بھی موجود ہیں۔ میری ملازمت جاتی رہے گی۔ تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔ میں ابھی نکل جاتا ہوں مگر پھر کب اور کہاں........؟''

عرضی گذار نے بھرپور آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں ادھورا سا سوال کیا۔ اُس نے ایک کاغذ اِس کی طرف بڑھایا اور پھر واپس لے لیا۔ مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر عرضی گذار اُس کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھولنے وہ خود آیا اور پوچھا ''تم اپنے پیچھے پیچھے کسی اور کو تو نہیں لا رہے ہو؟''

''جناب! آپ کیا بات کرتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دِلا چکا ہوں کہ مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے۔''

''رنگ وغیرہ تو نہیں اِستعمال کیا ہے اور نمبر وغیرہ اپنے پاس محفوظ تو نہیں

کرر کھے ہیں۔''

''جناب! آپ مجھے کیوں بار بار شرمندہ کر رہے ہیں۔ اب میں آپ کو کیسے یقین دِلاؤں کہ میں بالکل ایک بے ضرر آدمی ہوں۔''

''یہ سب باتیں میرے لئے احتیاطاً ضروری ہیں اور ہاں! ایک بات اور بھی ضروری ہے۔''

''وہ کون سی؟'' عرضی گذار ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

اُس نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اگر بُرا نہیں مناؤ تو میں تمہاری تلاشی لے لوں۔ پوچھو کیوں؟ وہ اِس لئے کہ کل تک ہم کیمرے کو فوٹو کھینچنے والا آلہ سمجھتے تھے مگر آج کل کیمرا ایک خفیہ ہتھیار کے طور پر اِستعمال ہو رہا ہے۔ ایک ایسا ہتھیار جو کسی بھی چنگے بھلے شریف آدمی کو سرِ بازار ننگا کر دے۔''

''آیئے جناب! تلاشی کر لیجئے۔ میں بالکل بے ضرر آدمی ہوں۔''

عرضی گذار اپنے دونوں بازو اور پیر پھیلا کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اُس نے اِس کے سارے جسم پر سکیورٹی والوں کی طرح ہاتھ پھیرا اور پھر خوشی کے انداز میں کہا ''آؤ' آؤ۔ اندر آجاؤ۔'' وہ اِسے سیدھا اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا اور وہیں سے بیوی کو آواز لگائی۔ ''مہمانِ خاص' دو کپ چائے شاندار!''

اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''اِس وقت میں گِن نہیں رہا ہوں۔ مگر پورے تو ہیں نا؟'' جواب میں عرضی گذار نے کہا ''ہاں! بالکل پورے ہیں۔ آپ بے شک گِن لیجئے' ایک بھی کم نہیں ہو گا۔ آخر ایمانداری بھی تو کوئی چیز ہے۔''

مہمانِ خاص کو الوداع کرنے کے لئے وہ گیٹ سے باہر تک آیا۔ کچھ دیر تک باہر ہی ٹہلتا رہا۔ دو ڈھائی دِن تک تردّد میں رہا اور پھر بے فکر ہو گیا۔ اِس احساس سے کہ سارا معاملہ بخیر و خوبی طے پا گیا' اُس کا دِل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگتا۔

ایک شام وہ اپنے ٹیلی ویژن پر چینل بدلتے بدلتے ایک خاص پروگرام دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ اُس کی دِلچسپی بڑھتی ہی گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ خود حیران پریشان اور مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ کیمرے کی پکڑ میں آئے دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ اپنی تصویریں اور اپنی باتیں ٹیلی ویژن کی زبانی سن کر اُس پر حیرتوں اور ندامتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ آناً فاناً ہی زمین میں دھنس جائے۔ اب وہ کیوں کر اور کیسے کسی کو اپنا منہ دِکھائے گا۔ ''اِس وقت میں اپنے سرکاری دفتر میں ہوں۔''

''تم اپنے پیچھے کسی اور کو تو نہیں لا رہے ہو۔''

''تم اگر بُرا نہیں مناؤ تو میں تمہاری تلاشی لے لوں۔ پوچھو کیوں؟ وہ اِس لئے کہ کل تک ہم کیمرے کو فوٹو کھینچنے والا آلہ سمجھتے تھے مگر آج کل کیمرا ایک خفیہ ہتھیار کے طور پر اِستعمال ہو رہا ہے۔ ایک ایسا ہتھیار جو کسی بھی چنگے بھلے شریف آدمی کو سرِ بازار ننگا کر دے۔''

''اِس وقت میں گِن نہیں رہا ہوں۔ مگر پورے تو ہیں نا؟''

یہ سب باتیں سُن کر اور ساتھ میں اپنی تصویریں مع حرکات و سکنات دیکھ کر اُسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ یہ کھلواڑ اُس آدمی نے کیا ہے جس نے اُس کی بدولت حکومت سے لاکھوں کا فائدہ اُٹھایا اور جو خود کو ''بے ضرر'' اِنسان کہتا تھا۔

''بے ایمان کہیں گا!'' اُس نے اُسے ایک زوردار گالی دی۔

''مگر یہ کیمرہ آخر اُس کے پاس تھا کہاں؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''اور یہ کیسا کیمرہ ہے جو نظر بھی نہیں آتا ہے۔ یہ کیمرہ ہے کہ شیطان؟'' اُس کے اندر سے ایک سوال سا اُبھرا۔

اور پھر اگلے ہی لمحے اپنے اندر سے ہی اُسے اِس کا جواب بھی مل گیا۔

''یہ اِکیسویں صدی کا اِنسان ہے۔''

○○○

مولوی باسط علی نے بیوی کو گھر سے کیا نکالا' سارا گھر ہی اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔روپیہ پیسہ' زیور' برتن' کپڑے' بستر' اناج اور دیگر سبھی کارآمد چیزیں اور حد یہ کہ ان سبھی چیزوں کے غائب ہونے کی مولوی جی کو خبر تک نہیں ہوئی۔

خبر تو اُس دِن ہوئی جب ایک روز مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں کو ایک پُر جوش وعظ دے کر وہ گھر لوٹے اور گھر کو معمول کے خلاف تالا لگا دیکھا اور اپنے سبھی بیٹے' بیٹیوں کو غائب پایا۔اُس روز صبح مولوی صاحب جمعہ کی نماز کے لئے معمول کے مطابق گھر سے رُخصت ہوئے' تاہم وہ ایک مخصوص تقریر کی باقاعدہ تیاری کر کے گئے تھے۔نماز کے بعد اُنہوں نے اپنی مخصوص اور پُر جوش تقریر شروع کی۔اُن کی تقریر کا لب لِباب یہ تھا کہ اولاد اپنے والدین کی فرمانبرداری اور اِطاعت کرتے ہوئے اُن کی ہر خواہش کا احترام کرے اور اُن کا ہر حکم بجالائے اور اولاد کو فرمانبردار بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ والدین شروع سے ہی اپنے بچوں کی تربیت اِس ڈھنگ سے کریں کہ بچے زندگی بھر کے لئے اُن کے تابعدار اور فرمانبردار بن جائیں۔اپنی تقریر میں اُنہوں نے لڑکیوں کے لئے اسکول کی تعلیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اسکول کی تعلیم پاکر لڑکیاں وہ حدیں پار کر جاتی ہیں جن کی اُنہیں پابندی کرنی ہوتی ہے۔بقول اُن کے ''یہ اسکول کی تعلیم کا فتور ہے کہ آج کل لڑکیاں اپنے والدین کی مرضی کو بالائے طاق رکھ کر اپنی مرضی سے نہ صرف شادی کرتی ہیں بلکہ گھر سے بھاگ کر والدین کے منہ پر کالک تک پوت دیتی ہیں۔'' اُنہوں نے پُر زور طریقے سے گاؤں بھر کے لوگوں

سے اپیل کی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو اسکول کی تعلیم دینے سے باز رہیں۔ مولوی صاحب کی آواز میں سوز تھا' درد تھا اور باتوں میں وزن تھا۔ گاؤں بھر سے آئے لوگوں نے نہ صرف اُنہیں غور سے سنا بلکہ اُن کی باتوں کی تائید بھی کی اور بہت سوں نے تو' جو اُن کے گھریلو حالات اور واقعات سے واقف تھے' اُسی وقت یہ مصمّم اِرادہ کرلیا کہ وہ کل سے ہی اپنی جوان ہورہی بیٹیوں کو اسکول جانے سے روک دیں گے۔

مولوی صاحب یوں تو آئے دِن اپنے خطبوں اور تقریروں سے علاقے کے لوگوں کو فیضیاب کرتے رہتے تھے۔ اُن کی آواز کبھی عیدگاہ سے گونج رہی ہوتی تو کبھی سائیں بابا کے مزار سے۔ کبھی محرم کے جلوس میں تو کبھی عید میلاد النبیؐ کے جلوس میں اُن کی آواز کانوں میں رس گھولتی۔ وہ گھروں میں ختم شریف پڑھنے کے لئے جہاں جہاں جاتے' وہاں کی مسجد میں اذان اور نماز کے بعد پند و نصائح پر مبنی اپنی تقریر سے لوگوں کو فیضیاب ضرور کرتے۔ بے شک وہ اپنی تقریر میں عورتوں سے متعلق باتیں کرتے اور یہ ضرور کہتے کہ عورتیں پردہ کریں' صوم وصلوٰۃ کی پابند رہیں' نماز پڑھیں' شوہروں کی خدمت کریں' بچوں کی تربیت اِسلامی طریقے سے کریں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اُنہوں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ لڑکیوں کو اسکول کی تعلیم سے باز رکھا جائے' بلکہ دیگر لوگوں کی طرح کل تک وہ بھی اپنی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسکول بھیجتے رہے تھے۔ اُن کی بڑی بیٹی میٹرک پاس کرچکی تھی جبکہ دُوسری بیٹیاں بالترتیب میٹرک اور مڈل میں پڑھ رہی تھیں۔ مگر اب کہ کچھ عرصہ سے اُنہوں نے نہ صرف اپنی بیٹیوں کو اسکول جانے سے روک رکھا تھا بلکہ وہ دُوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے کی تلقین کررہے تھے اور اپنی مخصوص تقریر میں تو اُنہوں نے واضح طور پر اور پُر خلوص انداز میں لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو اسکول نہ بھیجیں اور اُنہیں گھر پر صرف دینی تعلیم ہی دیں۔ دراصل اُن کی تقریر اور اپیل کے پیچھے وہ حادثہ تھا' جو اُن کے گھر میں چند ماہ قبل پیش آیا تھا اور وہ خط بھی تھا جو اُن کی بڑی بیٹی گھر سے جاتے وقت اُن کے نام لکھ کر گئی تھی۔

مولوی صاحب کے گھر کی فضا اُن کی بڑی بیٹی صبیحہ کے رِشتے کو لے کر گزشتہ چھ ماہ سے مکدر تھی۔ ویسے مولوی صاحب کے گھر کی فضا ہمیشہ ہی ابر آلود اور مکدر رہتی تھی۔ صبیحہ کی ماں کے ساتھ اُن کی دُوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی اُن کے گھر دو سال رہی مگر اُن کے گھر آنگن میں کوئی گُل بوٹا نہ کھلا سکی۔ اِسی وجہ سے اُنہیں دُوسری شادی کرنی پڑی تھی۔

دُوسری شادی کے لئے اپنے رِشتہ داروں کی مدد سے اُنہوں نے لڑکی ڈھونڈی۔ رشتہ طے کیا مگر عین شادی کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے لڑکی والوں نے مولوی جی کے سامنے پہلی بیوی کی طلاق کا مطالبہ رکھ دیا۔ مولوی جی یہ مطالبہ سن کر سخت تشویش میں پڑ گئے۔ ''اب کیا کروں؟ لڑکی والوں نے یہ کیسا بے جا مطالبہ رکھ دیا ہے۔ شادی سے اِنکار کر دُوں یا پھر پہلی بیوی کو طلاق ہی دے ڈالوں؟''

وہ کئی دِن تک سوچتے رہے مگر یہ دونوں ہی کام اُن کے لئے مشکل تھے۔ بچوں کے لئے دُوسری شادی ضروری تھی مگر پہلی بیوی کو بھی وہ کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بہ یک وقت دو بیویوں کے شوہر کہلوانا چاہتے تھے۔ کئی دِنوں تک غور و فکر کرنے کے بعد آخر اُنہوں نے اپنے ہونے والے سُسرالیوں کی منّتیں تک کر ڈالیں۔

''مردوں کے ہاں چار چار بیویاں بھی ہوتی ہیں!'' اُنہوں نے دہائی دی مگر وہ نہ مانے۔ اُنہوں نے مجبوراً اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر رُخصت کر دیا۔ یوں مولوی صاحب دُوسری بیوی کو گھر لائے۔ دُوسری بیوی نے اُنہیں چار بیٹیاں اور دو بیٹے دیئے مگر اِس سب کے باوجود مولوی صاحب کا رویہ بیوی کے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا۔ اُنہیں پہلی بیوی کے چھِن جانے کا نہایت ہی غم تھا۔ عام طور پر وہ دِن کو باہر ہی رہتے اور دِن ڈھلے جب گھر آنگن میں داخل ہوتے تو لگ بھگ گرجتے برستے ہی داخل ہوتے اور کوئی نہ کوئی اِلزام دیتے ہوئے گھر میں وارد ہوتے۔

ایک روز وہ معمول کی طرح گرجتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

''ارے! تمہیں باہر کی بھی کچھ خبر ہے یا نہیں؟ جب دیکھو گھر کے اندر ہی

گھسی رہتی ہو۔ اِدھر دیکھو تو، نل سے پانی بہہ بہہ کر کہاں تک چلا گیا۔''

مولوی صاحب کی چھوٹی بیٹی نے اُنہیں بتایا کہ ماں گھر پر نہیں ہیں۔ وہ پڑوس میں گئی ہیں اور ابھی ابھی گھر میں ایک مہمان عورت آئی ہیں۔ وہ اندر داخل ہوئے اور سامنے ایک مہمان عورت کو دیکھ کر اُنہیں خجالت محسوس ہوئی کہ بِن دیکھے ہی وہ کچھ زیادہ ہی تلخ آواز میں بول گئے۔

باتوں ہی باتوں میں مہمان عورت نے اُنہیں اِطلاع بہم پہنچائی کہ اُن کی مطلّقہ بیوی نے اپنے نئے شوہر کے ہاں دو جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے۔ یہ خبر سُن کر مولوی صاحب دل ہی دل میں کڑھنے لگے۔ ''کم بخت نے میرے ہاں دو سالوں میں ایک بھی نہ جنا اور اب وہاں سال کے اندر ہی دو دو بچوں کو جنم دے ڈالا۔''

کچھ دیر بعد جب بیوی گھر لوٹی تو مولوی صاحب کو کچھ زیادہ ہی برہم پایا۔ مولوی صاحب نے اُسے برہمی سے پوچھا ''کہاں گھومنے چلی جاتی ہو؟'' بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُن کی مزاج شناس تھی اور خود ٹھنڈے مزاج کی مالک تھی۔ یوں نبھتی گئی مگر کبھی کبھی چپقلش بھی ہوتی رہتی تھی اور یوں گھر کی فضا ابر آلود ہی رہتی۔

مولوی صاحب کے گھر کی فضا بے شک ابر آلود رہتی مگر مولوی صاحب باہر کے لوگوں میں کافی مشہور اور ہر دِل عزیز تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر نکاح پڑھوانے کے لئے اُنہیں خصوصی طور پر بلایا جاتا تھا۔ لوگ آپسی جھگڑوں کا تصفیہ کرانے کے لئے بھی مولوی صاحب ہی کو زحمت دیتے اور میاں بیوی کے آپسی اِختلافات، مثلاً طلاق اور رجوع جیسے معاملات تو مولوی صاحب کی شمولیت کے بغیر طے پاتے ہی نہیں تھے۔ کسی نے اگر غصے میں آکر بیوی کو کہیں ماں، بہن کہہ دیا یا طلاق، طلاق کہہ دیا اور معاملہ مولوی صاحب تک لے جایا گیا تو مولوی صاحب نے شرعی احکامات کی روشنی میں کسی کو تعزیر لگائی یا پھر کسی کو حلالہ کرنے کا حکم دے دیا اور یوں بیچ میں پڑ کر مسئلہ حل کر دیا۔ غرض یہ کہ لوگوں کے مسائل کا حل مولوی صاحب کے پاس تھا مگر اب خود اُن کا گھر

ایک مسئلہ بن چکا تھا اور یہ مسئلہ اُن کی بڑی بیٹی صبیحہ کے رِشتے کو لے کر شروع ہوا تھا۔

اُس روز صبیحہ بڑے ماموں کے گھر سے واپس لوٹی تو دیکھا کہ گھر کے بڑے سے آنگن میں منو کی چھاؤں تلے چارپائی پر ایک ٹھگنے سے قد اور لگ بھگ بھدے سے نقوش والا لڑکا آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالے مہمان کی حیثیت سے براجمان ہے اور صبیحہ کے دونوں چھوٹے بھائی بھی اُس کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ سر پر ٹوپی اور شلوار قمیض پہنے ہوئے ہے اور اُس کے تیل میں لتھڑے ہوئے بال ٹوپی کے نیچے سے کندھوں تک جھول رہے ہیں۔ صبیحہ نے ایک بھرپور نگاہ سے سب کچھ ہی پرکھ لیا تھا۔ اُسی لمحے اُس کا دِل زور سے دھڑکا۔ ''ہائے! یہ کہیں وہی تو نہیں ہے، جس کا کچھ دِنوں سے ہمارے گھر میں آنے کا چرچا تھا؟ نہیں! کوئی اور ہوگا۔ کسی اور کام سے آیا ہوگا! مگر مہمانوں کی طرح مزے سے بیٹھا ہے۔''

لمحے بھر میں طرح طرح کے خیالوں اور اندیشوں میں گھری صبیحہ تیزی سے آنگن سے گزر کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اجنبی لڑکے کی نظریں صبیحہ کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر تک چلی گئیں اور پھر دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ صبیحہ نے جلدی سے اپنی چھوٹی بہن نازیہ سے پوچھا۔ ''ارے نازی! یہ باہر کون بیٹھا ہے؟''

''باجی! تم نے اچھی طرح سے اُسے دیکھ لیا ہے نا؟'' نازیہ سیدھا سا جواب دینے کے بجائے پہلے مسکرائی پھر کچھ شرارتی انداز میں کہا۔

''ہنھ! ارے اُس میں دیکھنے کو ہے کیا؟ جلدی سے بتا یہ ہے کون؟'' صبیحہ اُتاولی ہو رہی تھی۔ ''باجی! یہی تو ہیں مولوی اکبر علی کے صاحبزادے اور ہمارے ہونے والے بہنوئی اصغر علی۔''

نازیہ کے کہنے کا انداز کچھ خوشگوار اور شرارتی سا تھا مگر صبیحہ کے لئے یہ جانکاری جیسے ایک سیلابی ریلہ ہو، جو اُس کی ہستی کے خوش رنگ جذبوں کو بہا لے گیا ہو۔

اَن دیکھے اصغر علی کے حوالے سے اُس نے کوئی زیادہ محل تو نہیں بنائے تھے،

یہ تو وہ جانتی ہی تھی کہ سہیل کی جگہ کوئی نہیں لے سکے گا، اُس جیسا خوبصورت کوئی نہیں ہوگا۔ بہر حال اچھا ہی ہوگا۔ اپنے باپ کی مرضی کا احترام کرتے ہوئے وہ سہیل کو اب لگ بھگ بھول ہی چکی تھی۔ مگر یہ کیا! گھر کے آنگن میں بیٹھے اُس شخص کو ایک بار دیکھنے کے بعد اُسے دُوسری بار دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور پہلی نظر میں جو دیکھا، اُس سے کراہیت کے سوا اُسے کچھ نہ ملا تھا۔

صبیحہ کے سفید و گلابی چہرے کا رنگ اب ہلدی مائل ہوگیا تھا۔ اُس کے ہونٹ سل گئے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھاری بوجھ تلے دبی جا رہی ہو۔

"آہ! کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ، جو پہلی ہی نظر میں دِل ہار جاتے ہیں......... میں بھی تو خوش نصیب ہوتی اگر سہیل کے ساتھ بیاہ دی گئی ہوتی۔ سہیل کو دیکھتے ہی میں اُس پر فدا ہوگئی تھی۔ مگر ابا جی! ہائے! ابا جی نے سہیل کے رِشتے کو ٹھکرا دیا اور اب اِس بھتنے سے میری شادی کرنے جا رہے ہیں۔"

صبیحہ کے دِل میں ایک ایک کر کے خیال اُبھرنے لگے۔ نازیہ نے اُس کی غیر ہوتی حالت بھانپ کر آہستگی سے پوچھا۔ "کیوں باجی! اچھا نہیں ہے نا؟"

"بالکل نہیں ہے۔" صبیحہ نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں اُس سے شادی کرنے والی نہیں ہوں۔"

مگر باجی! اب کیا ہوسکتا ہے؟ مولوی اکبر علی کتنی ہی بار ہمارے گھر آ چکے ہیں۔ ابا جی تمہاری شادی کے معاملے میں سب کچھ ہی طے کر چکے ہیں اور ابا جی کو تو تم جانتی ہو۔ وہ اپنی بات سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔" چھوٹی بہن نے ہمدردانہ انداز میں دلیل پیش کی۔

"مگر ایک کام تو ہوسکتا ہے، نا۔" صبیحہ خیالوں میں گم ہوتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟" نازیہ نے جلدی سے پوچھا۔

"میں مر جاؤں گی۔" صبیحہ نے نہایت جذباتی انداز میں دانت بھینچ کر کہا اور

اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''اللہ رے باجی! یہ کسی باتیں کرنے لگی ہو؟'' نازیہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''تو تم ہی میری جگہ لے لو۔'' صبیحہ کے غصے اور جھنجلاہٹ کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ نازیہ کا حیرت سے منہ کھل گیا۔

ساتھ والے کمرے کی کھڑکی کے پاس کب سے کھڑی اُن کی ماں دونوں بہنوں کی باتیں سُن رہی تھی اور اُس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے صبیحہ سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی کہ وہ ایسی واہیات باتیں کرے گی۔ اُس کا خیال تھا کہ صبیحہ گاؤں کی عام لڑکیوں کی طرح چپ چاپ رہے گی اور پھر روتی بلکتی ڈولی میں بیٹھ کر سسرال رُخصت ہو جائے گی، مگر صبیحہ تو بڑے جوش و خروش سے بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ابھی صبیحہ کو چوٹی سے پکڑ کر اُس کا سر فرش سے ٹکرا دے تاکہ اُس کا دِماغ ٹھکانے آ جائے۔ مگر گھر میں آئے ہوئے، ہونے والے داماد کی موجودگی کی وجہ سے اُس نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔

رات کو صبیحہ نے کھانا نہیں کھایا۔ ماں اُسے منانے کے بجائے قہر آلود نظروں سے دیکھتی رہی اور خود کلامی کے انداز میں اُسے وقفے وقفے سے جلی کٹی باتیں کہتی رہی۔ وہ منتظر تھی اصغر علی کی واپسی کی۔ دُوسرے روز اصغر علی واپس ہوا تو صبیحہ کی ماں نے اُسے آگھیرا۔ ''کم عقل، بدتمیز، بیوقوف! تیری یہ مجال کہ تُو اِنکار کرے۔ تیری جرأت کیسے ہوئی اِنکار کرنے کی؟ آخر تُو چاہتی کیا ہے؟ دس جماعتیں کیا پڑھ لیں کہ تُو اپنے آپ میں ہی نہیں رہی۔ نہ باپ کی عزت کا خیال، نہ برادری کا۔ خبردار! آئندہ جو اُلٹی سیدھی بات کی۔'' ماں نے جی بھر کر صبیحہ کی ڈانٹ پھٹکار کی اور وہ سر جھکائے سنتی اور روتی رہی۔ اُسے اپنی ماں سے ایسے روّیے کی اُمید ہرگز نہیں تھی۔ آج تک ماں بیٹی کے درمیان کبھی کسی طرح کی ناراضگی یا چپقلش ہوئی ہی نہیں تھی اور اب اِس ڈانٹ پھٹکار کے بعد ماں بیٹی کے درمیان بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔ رہ رہ کر ماں اگر

بات کرنے کی کوشش بھی کرتی تو صبیحہ کوئی جواب نہ دیتی۔اب وہ نہ تو گھر کے کام کاج میں حصہ لیتی اور نہ ہی وقت پر کھانا کھاتی۔بس چُھپ چُھپ کر روتی رہتی۔مہینہ بھر کے اندر ہی اندر صبیحہ کی بُری حالت ہوگئی تھی۔ذرا سا منہ نکل آیا تھا۔آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے جیسے برسوں کی بیمار ہو۔گھر میں اب پہلے جیسی چہل پہل نہیں رہی تھی۔بس خاموشی ہی خاموشی تھی اور یہ خاموشی مولوی جی کی آنکھوں سے اوجھل نہیں تھی۔وہ کئی دِنوں سے بدلے بدلے ماحول کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے مگر خاموش تھے۔

صبیحہ اب اُن کے کپڑے نہیں دھوتی تھی۔اُن کے ہاتھ دُھلوا کر اُنہیں کھانا پیش نہیں کرتی تھی۔ابا جی، ابا جی کی رٹ لگا کر اُن سے کوئی بات نہیں پوچھتی تھی۔بس گھر کے اندر ہی گھسی رہتی تھی۔

صبیحہ کی یہ حالت دیکھ کر اُس کی ماں بھی من ہی من دُکھی رہنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ اُس کی سوچ میں بدلاؤ آ گیا۔"ہاں! میری صبیحہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔جب لڑکا ہی اُسے پسند نہیں تو وہ کیوں کر نبھائے گی۔شادی میں شکل وصورت اور پسندیدگی ایک خاص معنی رکھتی ہے۔قد کاٹھ اور شکل وصورت پسند نہیں ہو تو میاں بیوی ایک دُوسرے کے لئے بوجھ بن جاتے ہیں۔نت نئے مسائل اور جھگڑے جنم لیتے ہیں۔شوق اور جذبے نفرت اور حقارت کی دبیز تہوں میں دبتے چلے جاتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی لے کر جھگڑے جنم لیتے ہیں اور بالآخر چھٹکارا اور نپٹارا تک مشکل ہو جاتا ہے۔اُف! بہت کٹھن ہوتا ہے ایک ناپسندیدہ وجود کے ساتھ نبھاہ کرنا!"

اِس سوچ اور بدلاؤ کے بعد صبیحہ کی ماں کا رویہ اُس کے ساتھ ہمدردانہ ہو گیا۔

اب وہ اُسے منا منا کر کھانا کھلاتی تھی۔ایک روز اُس نے صبیحہ سے ملتجانہ انداز میں کہا "دیکھ بیٹی! میں تیرا غم اچھی طرح سے سمجھتی ہوں۔میں تیرے ابا جی سے اِس بارے میں بات کرنے کا حوصلہ جتا رہی ہوں مگر تو کوئی اُلٹی سیدھی بات نہیں کرنا۔میں تیرے ساتھ جو ہوں نا۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔"

صبیحہ بھی خود ابّا جی سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ لے دے کر اُسے ماں سے ہی اُمید تھی اور اب ماں کے منہ سے یہ باتیں سن کر اُس کی خوشی کی اِنتہا نہ رہی۔ وہ اُٹھ کر ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔

''امّاں، امّاں! جس طرح سے بھی ہو سکے، مجھے اِس اَن چاہی شادی سے بچالو نہیں تو، نہیں تو میں مر جاؤں گی۔''

کئی دِنوں سے صبیحہ کی ماں اِس کوشش میں تھی کہ مولوی صاحب کسی دِن گھر ٹکیں یا بروقت واپس لوٹیں اور اچھے موڈ میں ہوں تو اُن سے بات کی جائے۔ آخر ایک روز مناسب موقعہ پا کر اُس نے مولوی جی سے بات چھیڑی۔

''ہم تو شادی کی تیاریوں میں جُٹے ہیں۔ آپ نے سارا سامان جٹا لیا ہے مگر صبیحہ اِس شادی سے اِنکار کر رہی ہے۔ وہ بہت بگڑ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو، کل کوئی اور مصیبت ہمارے لئے کھڑی ہو جائے۔'' بیوی قدرے رُک رُک کر رازدارانہ انداز میں باتیں کرنے لگی تھی۔

''مگر کیوں؟'' بیوی کی باتیں سن لینے کے بعد مولوی جی نے تلخ انداز میں پوچھا۔

''اب میں کیا جانوں؟'' یہ کہہ کر بیوی نے سر جھکا لیا۔

''اور یہ جانتے ہوئے کہ میں مولوی اکبر علی کو زبان دے چکا ہوں، تم بیٹی کو سمجھانے کے بجائے میرے پاس چلی آئی ہو۔ تم یہ چاہتی ہو کہ میں بے ایمانی کروں۔ زبان دے کر اب اِنکار کر دُوں۔ تم ایک مولوی کو علاقے بھر میں بے ایمان کہلوانا چاہتی ہو؟'' یہ کہتے ہوئے مولوی جی نے ڈنڈا اُٹھا لیا اور تابڑ توڑ بیوی پر برسانے لگے۔ اِس سے قبل جب کبھی مولوی صاحب جلال میں آتے تو بیوی ایک آدھ ڈنڈا یا دھکا مکّا کھا کر سامنے سے ہٹ جاتی تھی مگر آج وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ بس سی، سی کر کے مار کھاتی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ''مجھے جتنا چاہو مارو مگر بیٹی کی شادی روک دو۔''

دُوسرے کمرے میں کھڑکی کی اوٹ سے صبیحہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اُس کا

جی چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور ماں کے آگے کھڑی ہو جائے اور کہے کہ ''ابا جی! شادی سے اِنکار کرنے کا جرم میں نے کیا ہے۔ مجھے مارو، ماں کو نہیں۔'' وہ ایسا سوچ ہی رہی تھی کہ ابا جی گرجتے برستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اُن کا رُخ صبیحہ والے کمرے کی طرف تھا اور صبیحہ نے ہر حال میں خود کو اِس شادی سے بچانا تھا۔ یہ فیصلہ تو وہ بہت پہلے ہی کر چکی تھی۔ اُسی دِن سے جب اُس نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا تھا۔ لمحہ بھر میں اُس نے اپنے فیصلے کو پھر سے دہرایا اور اپنا اِرادہ پکا کیا۔

''ہاں! وہ بھی ماں کی طرح جی بھر کر مار کھائے گی تا کہ ابا جی کا غصہ اور جلال کم ہو جائے مگر ڈر کر شادی کے لئے ہرگز ہاں نہیں کہے گی۔ یہی ہے اِمتحان کی گھڑی ورنہ وہ زِندگی بھر جلتی اور کڑھتی رہے گی۔'' وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ قدموں کی آہٹ پر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ابا جی کے تابڑتوڑ ڈنڈے اُس پر برسنے لگے اور وہ رونے دھونے کے بجائے تُرکی بہ تُرکی جواب دینے لگی۔

''مجھے نہیں کرنی ہے یہ شادی۔ میں ساری عمر شادی کے بغیر رہوں گی۔ بھیک مانگ کر گزر بسر کر لوں گی۔ اچھا ہے مجھے جان سے ہی مار دو..........''

چند لمحوں بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا ابا جی کمرے میں نہیں آئے تھے۔ وہ دھیرے سے دروازے تک آئی۔ ابا جی سامنے والے راستے سے کہیں جا رہے تھے۔ وہ دوڑ کر ماں کی طرف گئی۔ اُس میں ہمت نہیں رہی تھی ماں سے نظریں ملانے کی۔ نازیہ پہلے سے ہی ماں کو سنبھال رہی تھی اور کہہ رہی تھی ''اماں! آپ نے جان بوجھ کر کیوں اِتنی مار کھائی؟ آپ جھٹ سے باہر کیوں نہیں نکلیں؟ اِس سے قبل ابا جی نے آپ کو اِتنا کبھی نہیں مارا تھا۔'' صبیحہ کو دیکھتے ہی نازیہ اُس پر برس پڑی۔

''باجی! یہ سب آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''

صبیحہ نے ایک نظر ماں کو دیکھا اور پلٹ آئی۔ اپنے کمرے میں گھس کر پہلے تو وہ جی بھر کر روئی، پھر آنسو پونچھ کر اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے لگی۔ ''اب کیا کروں؟ شادی

کے لئے تیار ہو جاؤں یا اِنکار پہ ڈٹی رہوں۔ نہ جانے ابا جی اب کون سا طوفان لائیں گے۔ بات بڑھے گی۔ آس پاس کے لوگ سنیں گے۔ کیا ابا جی کی طرف سے اُٹھائے گئے طوفان کا میں مقابلہ کرسکوں گی؟ شاید نہیں! تو پھر شادی کے لئے چارو نا چار تیار ہو جاؤں؟ مگر کس سے؟ اصغر علی سے!''

اب اُس کی آنکھوں کے سامنے اصغر علی کا سراپا تھا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار چیخ سی نکل گئی ''نہیں! نہیں! میں ساری مصیبتیں اُٹھالوں گی مگر اُس شخص کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔'' اُس نے پکا اِرادہ کرلیا۔

مہینہ بھر تک گھر کی فضا سوگوار بنی رہی۔ اِس بیچ مولوی اکبر علی کے گھر سے بھی کوئی آیا گیا نہیں مگر ایک شام اچانک مولوی اکبر علی اور اُن کا ایک قریبی رِشتہ دار آن ٹپکے۔ صبیحہ کا دِل دھک سے رہ گیا۔ جسم سے مانو جیسے جان نکل گئی ہو۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اب یہ شادی کینسل!

کچھ دیر بعد اُس نے ماں سے مری مری سی آواز میں پوچھا ''اماں! یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟'' ماں نے ایک گہری آہ بھری اور کہا ''بیٹی! تاریخ مقرر کرنے آئے ہیں۔'' یہ حقیقت سنتے ہی اُس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ کچھ دیر تک اُس پر سکتہ سا طاری رہا۔ پھر اُس نے نہایت ہی بے بسی کے عالم میں ماں سے اِتنا ہی پوچھا ''تو پھر؟'' اور آس بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ماں نے اُسے ترحّم اور شفیق نگاہوں سے دیکھا اور کہا ''تو پھر' یہی کہ تیرے ابا جی تیری شادی کر ہی دیں گے۔ اب کے تُو کچھ نہیں کہنا۔ بس یہی سمجھ لے کہ تیری قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے۔ میں نے تمہارے چچا اور تمہارے ماموں سے بھی اِس بارے میں بات کی تھی۔ وہ دونوں بھی یہی کہہ رہے تھے کہ لڑکی کو سمجھاؤ۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں کی باتیں کون سنتا ہے۔ اِس لئے میری بیٹی' اب تُو بھی شریف بیٹیوں کی طرح خاموش رہ اور کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا۔'' ماں اُسے اُونچ نیچ سے آگاہ کرتے ہوئے سمجھاتی

رہی مگر صبیحہ کے کان جیسے سماعت سے عاری ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت جان کر کہ اب اُس کی شادی اصغر علی ہی سے ہونے والی ہے اور اب راہِ فرار نا ممکن ہے' اُس کے اندر ایک عجیب سی ہلچل ہونے لگی۔ ایک طوفان سا برپا ہوا اُٹھا۔ اِسی طوفان سے ایک دلیر اور بغاوت پر آمادہ لڑکی بھرپور اعتماد اور قوت کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

صبیحہ اب اُس دلیر لڑکی کے دِل و دماغ سے سوچ رہی تھی۔ اُس کی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ ''ہنھ! دیکھتی ہوں کیسے ہوتی ہے یہ اَن چاہی شادی؟ یہاں زبردستی کی شادیاں ہوتی ہیں۔ پھر ناچاکیاں ہوتی ہیں' لڑائیاں ہوتی ہیں' پھر طلاقیں ہوتی ہیں اور ابّا جی حلالہ کروا کر لوگوں کو عبرت دیتے ہیں۔ میں بھی ایک عبرت دُوں گی کہ اب کے بعد کوئی بھی اپنی بیٹی کی زبردستی شادی نہیں کرے گا۔ بھلا ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ عمر بھر رہنا کہاں کا اِنصاف ہے؟ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ اصغر علی کے پلّے پڑنے سے بچنا ہے۔'' رات بھر صبیحہ کا دِماغ ایک منصوبہ ترتیب دیتا رہا اور اُس کے ابا جی اور مولوی اکبر علی دُوسرے کمرے میں رات گئے تک نکاح وغیرہ کی تاریخ مقرر کر کے شادی سے متعلق دیگر ضروری امور پر بات چیت کرتے رہے۔

صبیحہ کا متواتر تیسرا پیغام پا کر سہیل سنجیدہ ہو گیا اور سوچنے لگا۔ صبیحہ کے پیغام میں بس ایک ہی اِلتجا تھی ''سہیل! جس طرح سے بھی ہو سکے ایک بار مجھ سے ملنے کی زحمت گوارا کرو۔''

سال بھر قبل سہیل اور اُس کے والدین نے باقاعدہ طور پر صبیحہ کا رِشتہ مانگا تھا مگر مولوی جی نے اِس بنا پر سختی سے اِنکار کر دیا تھا کہ وہ اپنی برادری سے باہر رِشتہ نہیں دیں گے اور اپنے بیٹے بیٹیوں کے رِشتے صرف اپنی برادری اور اپنے قبیلے میں ہی کریں گے۔

اُس وقت صبیحہ اور سہیل دِل ہی دِل میں بہت دُکھی ہوئے تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ صبیحہ کی ماں کا بھی یہ ماننا تھا کہ اگر یہ شادی ہو جاتی تو دونوں کی جوڑی بہت

چیچتی۔ دونوں ہی صاف رنگ، قدکاٹھ کے لمبے اور تیکھے نین نقوش کے مالک تھے۔ اُنہیں دیکھ کر لگتا جیسے قدرت نے دونوں کو ایک دُوسرے کے لئے بنایا ہو۔

سہیل دھڑکتے ہوئے دِل کے ساتھ، مگر نہایت ہی چوکس انداز میں صبیحہ کے بتائے ہوئے وقت اور مقام پر پہنچ گیا، جہاں وہ پہلے سے ہی اُس کی منتظر تھی۔ دونوں نے ایک دُوسرے سے جی بھر کر باتیں کیں۔ صبیحہ نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور اپنے مصمّم اِرادے سے سہیل کو آگاہ کرتے ہوئے اُس سے مدد کی اِلتجا کی۔ صبیحہ کو اب اِس بات کا ذرا بھی ڈر نہیں تھا کہ کوئی اُس کو سہیل کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لے گا اور اُس کے ماں باپ کو آگاہ کردے گا۔ وہ اب ایک دلیر لڑکی بن چکی تھی اور اصغر علی کے پلے بندھنے سے بہر حال اُس نے بچنا تھا۔

سہیل سے ملنے کے بعد صبیحہ کے روّیے میں اب بڑی حد تک تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ گھر کے کام کاج میں ذرا ذرا حصّہ لینے لگی تھی اور کسی بھی طرح غمگین دِکھائی نہیں دیتی تھی۔ یوں مولوی جی مطمئن تھے کہ گھر میں مار پٹائی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے۔ مولوی جی نے مقررہ تاریخ سے چند روز قبل بیوی کو آگاہ کرتے ہوئے کہا "پرسوں مولوی اکبر علی نکاح کی رسم انجام دینے آرہے ہیں۔ اُن کے ساتھ چند لوگ اور بھی ہوں گے۔ دعوت اور کھانے پینے کا اِنتظام وغیرہ اچھی طرح سے کروالینا۔ یہ مہینہ اور موسم شادی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ شادی اور رُخصتی چند ماہ بعد کردیں گے۔"

"منگنی کردیجئے نا۔ پہلے سے ہی نکاح خوانی کی کیا ضرورت ہے؟ جب شادی ہوگی، نکاح بھی ہوجائے گا۔" بیوی نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ مولوی جی نے گھور کر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جو میں کرتا ہوں وہ ٹھیک ہی کرتا ہوں۔ نکاح خوانی سے رِشتہ پکا ہوتا ہے۔ ہر دو فریق رِشتے کے پابند ہوجاتے ہیں۔ تم بس تیاری میں جُٹ جاؤ۔"

مقررہ تاریخ پر مولوی اکبر علی اپنے صاحبزادے اصغر علی اور دیگر رِشتہ داروں

کے ساتھ شام سے پہلے ہی آ موجود ہوئے۔ گھر میں بھی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ صبیحہ بھی دِن بھر سے چپ چاپ گھر کے کام کاج میں تھوڑی بہت مشغول رہی تھی۔ دونوں طرف کے رِشتہ داروں کی آمد سے گھر میں کافی چہل پہل تھی۔ شام کے بعد سے صبیحہ اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ رات مہمانوں کو بڑے اہتمام اور سلیقے کے ساتھ کھلایا پلایا گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور پھر تیاریاں ہونے لگیں نکاح خوانی کی اور ساتھ ہی سارے گھر سے صبیحہ صبیحہ کی آوازیں کانوں میں پڑنے لگیں۔ ہر کوئی ایک دُوسرے سے صبیحہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا' مگر صبیحہ کسی کو بھی اور کہیں بھی دِکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گھر میں تلاشِ بسیار کے بعد اُس کی ماں نے سر اور سینہ پیٹ پیٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ''ہائے! صبیحہ تُو کہاں مرگئی؟'' صبیحہ کی بہنیں بھی سسکیاں بھرنے لگیں۔ گھر میں دونوں طرف کے آئے مہمان ہکے بکے رہ گئے تھے کہ یہ صورتِ حال کیوں کر پیدا ہوئی۔ کچھ رِشتہ دار لڑکی کو اور کچھ لڑکی کی ماں کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ کچھ لڑکی کو کڑی نگرانی میں نہ رکھنے کا اِلزام دینے لگے اور مولوی جی پر تو جیسے ندامتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔ اُن پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔

عام طور پر لڑکیوں کا دِل نرم و نازک سمجھا جاتا ہے مگر صبیحہ نے ثابت کر دِکھایا تھا کہ ناموافقت اور اِنتقامی صورتِ حال میں یہی نرم و نازک دِل چٹان بھی بن سکتا ہے۔ صبیحہ کی ماں تو مولوی صاحب سے ہمیشہ ڈری ڈری اور سہمی رہی تھی۔ اُس نے ہمیشہ اِس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوئی بات یا کام مولوی صاحب کی مرضی کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔ شاید اِس لئے کہ مولوی صاحب گونج گرج کر بات کرنے کے عادی تھے یا پھر اِس لئے کہ اُس کی وجہ سے مولوی صاحب کو پہلی بیوی سے دست بردار ہونا پڑا تھا اور تیسری کے لئے اُس نے جواز نہیں چھوڑا تھا۔ بچے بھی پیدا کئے اور گھر کو سلیقے سے سنبھالا اور چلایا بھی۔

صبیحہ نے جو قدم اُٹھایا تھا یہ سب کے لئے اور اُس کی ماں کے لئے اِنتہائی

حیران کُن تھا۔ ''اُس چھوٹی سی لڑکی کا یہ دم!'' کافی دوڑ دھوپ کرنے اور اڑوس پڑوس کے گھروں میں بھی ڈُھونڈ لینے کے بعد صبیحہ نہیں ملی تو مولوی صاحب اپنی بیوی پر برس پڑے ''بتاؤ! بیٹی کو کہاں رُخصت کیا ہے؟'' بیوی قسمیں کھا کھا کر اِنکار کرنے لگی۔ ''مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ اُسے ڈُھونڈا جائے۔ وہ کہیں کنویں یا دریا میں نہ کود جائے۔ اُسے رات کو ہی ڈُھونڈ لیا جائے۔ ورنہ صبح کہیں سے اُس کی لاش ملے گی۔''

مگر مولوی جی کا کہنا تھا کہ ماں کی سازش کے بغیر کوئی بیٹی اِتنی جرأت نہیں کر سکتی ہے۔ چند رِشتہ داروں نے مولوی جی کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا اور سمجھانے لگے ''جو نہیں ہونا چاہئے تھا اب وہ ہو چکا ہے۔ ایسی بات تھی تو لڑکی کو کڑے پہرے میں رکھنا چاہیے تھا۔ اب مار دھاڑ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ صبح ہونے پر لڑکی کو ڈُھونڈ لیا جائے گا۔''

ہاتھ سے ڈنڈا چِھن جانے کے فوراً بعد مولوی جی نے دُوسرا ہتھیار اُٹھا لیا۔ وہی ہتھیار جس کے اِستعمال سے وہ لوگوں کو باز رہنے کی اکثر تلقین کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے سب کے سامنے پُر جوش انداز میں کہا ''ماں کی موجودگی میں بیٹی عین نکاح کے موقعہ پر فرار ہوئی ہے۔ اِس لئے میں بیوی کو طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔ یہ ابھی اور اِسی وقت میرے گھر سے نکل جائے۔ اِس نے اور اِس کی بیٹی نے بھری برادری میں میری ناک کٹوا دی ہے۔''

آناً فاناً ہی ایک اور اَنہونی ہو کر رہ گئی تھی۔ ''ایسا مت کہیے مولوی جی! غصہ تھوک دیجئے۔ لڑکی واپس آ جائے گی۔'' لوگ طرح طرح سے مولوی جی کو سمجھانے لگے مگر مولوی جی اُس وقت جلال میں آئے تھے۔ شعلہ بار ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بار بار کہا ''میں اِسے طلاق دیتا ہوں۔ یہ اِسی وقت میرے گھر سے نکل جائے۔''

اُدھر بیوی، مولوی جی کے یہ الفاظ سُن کر اور بیٹی کے غم کو لے کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ کچھ عورتیں اُسے سنبھالنے لگی تھیں۔ ایک بھونچال سا آ کر گزر گیا تھا۔ بیوی

سے فارغ ہونے کے کچھ ہی دیر بعد مولوی باسط علی اپنے ہونے والے سمدھی مولوی اکبر علی کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''میں آپ کو لڑکی دینے کی زبان دے چکا ہوں اور میں اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔ آپ کو خالی ہاتھ ہرگز نہیں جانے دُوں گا۔ میری دُوسری لڑکی گھر میں موجود ہے۔ آپ تیار ہو جائیے۔ نکاح خواں سے کہیے' وہ تیاری کرے۔''

مولوی اکبر سوچ میں پڑ گئے۔ اُدھر نازیہ تک جب یہ الفاظ پہنچے تو اُسے زوروں کی سردی لگی اور وہ پورے جسم سے کانپنے لگی۔ اُسے صبیحہ کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے ''تو تم ہی میری جگہ لے لو۔ ہنھ!'' تو کیا وہ گھڑی آ گئی۔ مجھے باجی کی جگہ لینی ہے؟'' وہ سوچنے لگی اور بری طرح گھبرانے لگی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اگلے کچھ ہی لمحوں میں قربانی کے بکرے کی طرح سب کے سامنے ذبح کر دی جائے گی۔

کچھ سوچ وچار کے بعد مولوی اکبر علی نہایت ہی بوجھل اور ناراضگی بھرے لہجے میں مولوی باسط علی سے گویا ہوئے ''گھر بُلا کر اچھی عزت افزائی کی ہے آپ نے ہماری۔ بیٹی بھلے ہی آپ کی گئی مگر ناک میری بھی کٹ گئی ہے۔ میں اپنے رِشتہ داروں اور برادری میں کون سا منہ لے کر جاؤں گا؟ بہرحال' اِس میں آپ کا بھی قصور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے لڑکی کو ڈھونڈا جائے۔ اُسے واپس لایا جائے۔ یہ آپ کے لئے اور میرے لئے بھی باعث افسوس اور شرمندگی کا مقام ہے کہ ہماری اولاد ہی ہم سے دغا کر گئی۔ اِس لئے ہم سب مل کر لڑکی واپس لائیں گے اور اُسی سے شادی کروائیں گے۔ ورنہ ہماری باقی لڑکیاں بھی اِس واقعہ سے شہ پا کر اِسی طرح والدین کے منہ پر کالک پوتتی رہیں گی' اور میں تو یہ کہوں گا کہ آپ نے اپنی لڑکیوں کو اسکول کی تعلیم دِلوا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ورنہ آج یہ واقعہ ہرگز ظہور پذیر نہ ہوتا۔''

چند دیگر لوگوں نے بھی مولوی اکبر علی کی اِن باتوں کی تائید کی اور کہا کہ لڑکی نہ ملنے کی صورت میں یقیناً دُوسری لڑکی بیاہ دی جائے گی۔ اُدھر ادھ مری' کمسن نازیہ

ماں کے پہلو میں آ کر دُبک سی گئی تھی۔ وہ رات جتنی تاریک تھی، اُس سے کہیں زیادہ

طویل بھی ہوگئی تھی۔ مولوی اکبر علی اپنے تعلق داروں سمیت صبح کے اندھیرے میں ہی غائب ہو گئے تھے۔ کچھ اُجالا ہوا تو مولوی باسط علی نے دیکھا کہ بیوی گھر میں ایک کھاٹ پر اُوندھے منہ پڑی ہے۔ وہ سر پہ آن پہنچے۔

''میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔''

اللہ کی بندی زور زور سے چیخ و پکار کرنے لگی۔ وہ گھر سے نکلنے کو بالکل تیار نہیں تھی۔ بیوی کے ایک بھائی بھی نکاح خوانی کی اِس تقریب میں رات بھر سے شامل رہے تھے اور سارے واقعات کا چُپ چاپ جائزہ لے رہے تھے۔ مولوی صاحب کی زیادتی پر وہ بے حد دُکھی ہو چکے تھے۔ صبیحہ نے جو قدم اُٹھایا تھا وہ سراسر اُس کے خلاف تھے مگر مولوی جی سے اُنہیں ہرگز یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے قصور کی سزا، اُس کی ماں کو دے کر اپنا بسا بسایا گھر اُجاڑ دیں گے۔ وہ اُٹھے اور مولوی صاحب کو کچھ کہے بغیر اپنی بہن کو بازو سے پکڑ کر زبردستی اپنے گھر لے گئے۔

ڈھیروں افسوس کرنے کے بعد ایک ایک کر کے سبھی مہمان بھی رُخصت ہو گئے۔ اب کے گھر میں رہ گئے تھے مولوی باسط علی، اُن کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے، جو کہ پانچویں اور چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔

دِن رات سہمے سہمے اور خاموش سے گزرنے لگے۔ ایک روز مولوی باسط علی تخت پوش پر بیٹھے کسی سوچ میں غرق تھے کہ نازیہ ڈرتے ہوئے اُن کے پاس آئی اور ایک تہہ کیا ہوا موٹا سا کاغذ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ''ابا جی! آج میں باجی کا بستر جھاڑنے لگی تو مجھے یہ کاغذ تکیہ کے نیچے سے ملا۔'' مولوی جی نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ تھام لیا اور کھول کر دیکھنے لگے۔ وہ اُن کے نام صبیحہ کا لکھا ہوا خط تھا۔ وہ خط پڑھتے گئے اور اُن کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ صبیحہ نے لکھا تھا۔

''ابا جی! میں نے جو قدم اُٹھایا ہے اُس کے ذِمہ دار آپ ہیں۔ کیونکہ آپ

جس کے ساتھ میری شادی کرانے جارہے تھے میں اُس کے ساتھ کبھی نہیں رہ پاتی۔ اگر آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہو بھی جاتے تو بھی مجھے بہت جلد طلاق کا طوق پہن کر آپ کے گھر لوٹنا پڑتا۔ میں نے آپ کے سخت روّیے کو دیکھتے ہوئے اپنی اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی بہتری کے لئے یہ قدم اُٹھایا ہے تاکہ آپ اُن کی شادیاں کرتے وقت اُن کی پسند اور ناپسند کو بھی ملحوظ رکھ سکیں۔ بے شک امّاں نے مجھے بہت سمجھایا تھا مگر میں اپنے دِل کے ہاتھوں مجبور تھی اور امّاں کی دی ہوئی ہدایتوں پر عمل پیرا نہیں ہوسکی۔ اِس کا مجھے افسوس ہے۔ میرا مستقبل کیا ہوگا' یہ میں نہیں جانتی مگر یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں ایسے ماں باپ کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی جو مجھے ایک ایسے شخص کے پلے باندھنے جارہے تھے جو مجھے کسی طور پر بھی پسند نہیں تھا۔''

خط پڑھنے کے بعد مولوی صاحب خود سے ہم کلام ہوئے۔

''تو اِس کا مطلب ہے صبیحہ کے بھاگنے میں اُس کی ماں کا ہاتھ نہیں ہے! صبیحہ نے جو کچھ بھی کیا' وہ اپنی مرضی سے ہی کیا ہے۔ آہ! اگر یہ سچ ہے تو میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔ مجھے صبیحہ کی ماں کو گھر سے نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی اِس لئے ہوشیار نکلی۔ طلاق دینے کی بات نہیں کہتا۔ یوں ہی کچھ دِن کے لئے اُسے گھر سے نکل جانے کو کہہ دیتا۔ کچھ دن بعد وہ لوٹ آتی مگر اب؟ اب کچھ نہیں ہوسکتا ہے سوائے پچھتانے کے۔'' مولوی جی نے سر ہتھیلی پہ رکھ دیا تھا۔

صبیحہ کو گھر سے فرار ہوئے مہینہ بھر سے زائد عرصہ ہوگیا تھا۔ اُس کا کوئی اتہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ ہے۔ مولوی جی نے پہلے ہی دِن سے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ صبیحہ نے چونکہ اپنے باپ کی عزت کو قدموں تلے روندا ہے' اِس لئے وہ نہ تو اُسے ڈھونڈیں گے اور نہ ہی کبھی اِس گھر میں واپس آنے دیں گے' حتیٰ کہ اپنے چل بسنے کے بعد بھی۔

گھر سے یکبارگی دو لوگوں کے چلے جانے سے گھر ویران ویران سا لگتا۔

خالی پن کا شدت سے احساس ہوتا۔ مولوی صاحب پہلے کے برعکس اب گھر میں ہی رہتے۔ گھر کے کام کاج اور بیٹے بیٹیوں کی نگرانی کرتے۔ بیٹے بیٹیوں کو ہدایتیں اور نصیحتیں دے دے کر گزشتہ خامیوں اور کمزوریوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے مگر اِس سب کے باوجود دِن رات بے چینی اور بے قراری میں گزرتے۔ کسی پَل اُنہیں سوچوں سے چھٹکارا نہیں مل پاتا۔ یہی حال اُن کے بیٹے بیٹیوں کا تھا۔ اب پہلے سی اُن کی آپسی باتیں اور شرارتیں باقی نہ رہی تھیں۔ بہن کے ساتھ ساتھ ماں کی کمی اُنہیں شدّت کے ساتھ محسوس ہو رہی تھی مگر مارے ڈر کے وہ باپ سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ اماں کو گھر لاؤ اور کہتے بھی کیسے؟ یہ تو جانتے ہی تھے کہ ماں کو طلاق دے کر گھر سے نکالا گیا ہے۔ اِس بات کا اُنہیں بے حد دکھ تھا کہ ابّا جی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

لگ بھگ چار ماہ بعد پتہ چلا کہ صبیحہ اور سہیل کورٹ میرج کر کے اپنا گھر بسا چکے ہیں۔ سہیل کے گھر والوں نے صبیحہ کو بصد خوشی بہو تسلیم کر لیا ہے اور وہ اپنے گھر میں ہزار سکھ کے ساتھ رہ رہی ہے مگر اِدھر مولوی صاحب کا گھر اُجڑا ہی رہا۔ دِن رات جنم لیتے رہے اور گزرے کل پر مرہم لگانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

اس واقعہ کو اب چھ مہینے ہونے کو تھے۔ بیٹیاں اسکول نہیں جاتی تھیں۔ وہ گھر پر ہی دینی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ وہ اکثر بڑی حسرت سے اپنی اسکولی کتابوں کو دیکھتیں۔ کبھی کبھی کھول کر پڑھتیں اور پھر بند کر کے الماری میں رکھ دیتیں۔ یہ اب اُن کے لئے شجرِ ممنوعہ تھیں۔ وہ مل جل کر کھانا پکاتیں۔ مولوی باسط علی پیٹ بھر کر کھاتے۔ دُعائے فاتحہ پڑھتے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے۔ اپنے بیٹے بیٹیوں کی اچھے ڈھنگ سے تربیت کرتے۔ اُنہیں ہدایتیں اور نصیحتیں دیتے۔ تابعدار اور فرمانبردار رہنے کی تلقین کرتے۔ خود عام طور پر گھر میں ہی رہتے تا کہ کوئی ایرا غیرا اُن کے گھر نہ آنے پائے۔ ختم شریف پڑھنے کے لئے اب کبھی کبھار ہی جاتے۔ البتہ جمعہ باقاعدگی سے پڑھنے کے لئے شہر جاتے اور اُس روز مولوی باسط علی جمعہ پڑھ کر جو گھر پہنچے تو دیکھا کہ گھر کو تالا لگا ہے اور

بیٹے بیٹیاں غائب ہیں۔

مولوی جی نے پریشان ہوکر اپنے گھر کے چاروں طرف کئی کئی چکر لگا ڈالے۔ زور زور سے آوازیں دیں۔ ایک ایک بیٹے اور بیٹی کا نام پُکارا مگر دُور دُور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ اُنہوں نے دروازے پر دستک دے کر گھر کے اندر آوازیں دیں، یہ سوچ کر کہ مبادا کسی نے میرے بچوں کو گھر کے اندر زبردستی بند نہ کر دیا ہو یا بچے خود کہیں ایک ساتھ کوئی واردات انجام نہ دے بیٹھے ہوں۔ مولوی جی کو طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے گھیرنے لگے۔ لگے ہاتھوں وہ پڑوسیوں کی طرف لپکے۔

''میرے لڑکے لڑکیاں آج کہیں نظر نہیں آرہے ہیں، کہیں آپ نے تو نہیں دیکھے؟'' مولوی جی ہر کسی سے پوچھنے لگے۔

''نہیں تو۔'' سب لاعلمی کا اِظہار کرنے لگے۔ چند پڑوسی مولوی جی کے ساتھ اُن کے دروازے تک آپہنچے اور مولوی جی کو دروازہ کھول کر اندر دیکھنے کو کہا۔ بڑا سا تالا تھا اور چابی کہیں سے بھی مل نہیں رہی تھی۔ کافی زور آزمائی کے بعد تالا توڑا گیا۔ مولوی جی کچھ اِس احتیاط اور انداز کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے جیسے گھر میں بھوت موجود ہوں یا کہیں ڈاکو چھپے بیٹھے ہوں۔ غرض یہ کہ ہر کمرے میں مولوی جی نے قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہوئے تاک جھانک کی مگر بیٹے بیٹیاں گھر کے اندر بھی نہیں ملے۔ مولوی صاحب سخت متحیر اور تشویش میں پڑ گئے۔

ایک پڑوسی نے کہا ''مولوی صاحب! آپ اپنے گھر کا سامان تو دیکھئے۔''

تب جھٹ سے مولوی صاحب سامان کی طرف متوجہ ہوئے اور دیکھتے کیا ہیں کہ چارپائیوں اور پلنگوں پر سے بستر غائب ہیں۔ مولوی جی برتنوں کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ بھی غائب پائے۔ کٹھار کے اندر جھانک کر دیکھا تو سال بھر کے لئے رکھا ہوا اناج غائب پایا۔ ڈھیروں اناج ایک دِن میں تو کہیں لے جایا نہیں جا سکتا تھا۔ بیٹے، بیٹیاں کہیں چوہوں کی طرح عرصہ سے لگے رہے تھے اور وہ صندوق، جو بیوی کی اکلوتی

ملکیت تھا، جس میں کپڑوں کے علاوہ کچھ روپے پیسے اور بیوی کے گہنے تھے، وہ سرے سے ہی غائب تھا۔ بچوں کی کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں خالی پڑی تھیں اور گھر کے پچھواڑے میں بندھی بھینس، جس کی دیکھ ریکھ پہلے مولوی جی کی بیوی کرتی تھی اور بیوی کے گھر سے جانے کے بعد مولوی جی اور اُن کے بیٹے، بیٹیاں مل جل کر کرتے تھے، وہ رمبھاں، رمبھاں کر کے ماحول کو اور بھی پُر اسرار اور سوگوار بنا رہی تھی۔ معاملہ اب صاف ظاہر تھا کہ بیٹے بیٹیاں اور کہیں نہیں گئے ہیں۔ وہ مع ساز و سامان کے صرف اور صرف اپنی ماں کے پاس اپنے ننھیال گئے ہیں جو دس بارہ کلومیٹر کی دُوری پر واقع تھا۔

اب مولوی جی ہنسیں کہ روئیں! ظاہر ہے یہ دونوں ہی کام اُن کے لئے مشکل تھے اور پڑوسی! وہ تو منہ میں پلوٹھونس رہے تھے۔ ایک ایک کر کے درجن بھر سے زائد پڑوسنیں ہمدردی جتانے کو جمع ہو چکی تھیں۔ ساتھ میں بچے بھی تھے جو گھر کے کونے کونے میں جا کر اُچھلنے کودنے لگے تھے۔ پڑوسنیں یوں تو اِظہارِ ہمدردی کر رہی تھیں۔

''ہاں بھئی! اپنا گھر آخر اپنا گھر ہوتا ہے۔ بچے کب تک دُوسروں کے گھر میں رہ پائیں گے۔ چار دِن کا سواد چکھ کر واپس اِسی گھر میں لوٹیں گے۔''

''ہاں بھئی ہاں! دُوسروں کے بچے بھی بھلا کسی کو راس آئے ہیں کبھی۔ چار دِن سے زیادہ نہیں رہیں گے ننھیال میں۔''

یوں ڈھیر ساری ہمدردیاں جتاتے ہوئے پڑوسنیں ایک کو چٹکی تو دُوسری کو کہنی مار رہی تھیں۔ کوئی دائیں آنکھ دبا رہی تھی تو کوئی بائیں۔ ہنسی اور باتیں اُن کے انگ انگ سے پھوٹی جا رہی تھیں مگر چند عورتیں نہایت سنجیدہ حالت میں تھیں۔ گھر کی ویرانی کو محسوس کر کے دُکھی تھیں اور افسوس کر رہی تھیں کہ کل تک یہی گھر ہنستا بستا تھا۔ ایک بیٹی ہی تو گئی تھی۔ بیٹیاں ہوتی ہی پرائی ہیں۔ مگر ستیاناس ہو اِس ''طلاق'' کا۔ اِسی ہتھیار نے تو اِس گھر کو ویرانوں میں بدل دیا ہے۔''

کچھ دیر خاصا جمگھٹا لگا رہا۔ گھر کی بچی کھچی چیزوں کو دیکھ کر مولوی جی کے دِل

میں آیا کہ وہ پڑوسیوں سے کہیں کہ گھر کی بچی کھچی ایک ایک چیز اُٹھا کر لے جائیں۔ کسی نے کیا کہا، کتنی ہمدردی جتائی، مولوی جی نے بہت ہی کم سنا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر نماز پڑھنے والے تھڑے پر بیٹھ کر سوچنے لگے۔

"اُف! یہ میری اولاد! اِسی اولاد کو پانے کے لئے میں نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے ڈالی تھی اور اب گزشتہ چھ مہینوں سے اُن کی کتنی تربیت کی، ہدایتیں اور نصیحتیں کیں، ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، کھانے پینے کی ہر چیز مہیا کی، لاڈ پیار کیا مگر یہ اولاد! میری نہ ہو کر، سب کے سب ماں کے پاس چلے گئے۔ اچھا اِنتقام لیا ہے اُنہوں نے مجھ سے۔"

مولوی جی سوچتے اور پریشان ہوتے چلے گئے۔ کچھ پڑوسی ہنسی اور کچھ غمی دِکھاتے ہوئے ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو چل دئے۔ مولوی جی اُٹھے اور گھر کے پچھواڑے میں بندھی ہوئی بھینس کو دیکھنے چل پڑے۔

وہ جھنجھلائے۔ "اب اِس کا چارہ پانی کیا میں کروں گا؟ صبیحہ نے میری عزت خاک میں ملائی جبکہ باقی اولاد نے میری کمر ہی توڑ کے رکھ دی ہے۔ مجھ میں اب اِتنی ہمت کہاں کہ میں ایک بھینس کی دیکھ ریکھ کر سکوں۔ میں اِس کو بھی آزاد کرتا ہوں، جیسے میں نے بیوی کو آزاد کیا ہے۔ اب اِسے کس کے لئے رکھوں۔ کون اِس کا دودھ پیئے گا! مگر نہیں!" اُنہوں نے دل ہی دل میں اپنے خیالات کی خود ہی تردید کی۔ "یہ بیوی نہیں ہے جو میرے حکم کی پابند رہے گی۔ بھینس ہے بھینس! اِسے آزاد کروں بھی تو یہ ہر کھیت کا چارہ چر کر پھر اسی تھان پر آ کر جگالی کرے گی۔"

یہی کچھ سوچتے ہوئے مولوی صاحب بھینس کے قریب پہنچ گئے۔ اُس کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا۔ وہ صبح کی بھوکی اور پیاسی تھی۔ مولوی جی بڑبڑا اُٹھے۔ "ہاں! تو کیا اب تیرے لئے گھاس میں لاؤں گا؟ تیرے لئے پانی کی بالٹیاں کیا اب میں بھروں گا؟ جن کو زِندگی بھر کھلایا پلایا، جن کے لئے خون پسینہ ایک کیا، وہ میرے نہیں

ہوئے تو تجھے میں نے کیا کرنا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے تیرا دُودھ۔ تُو بھی اُدھر ہی جا جہاں تیرے مالک گئے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے مولوی جی نے بھینس کے گلے سے رَسّہ نکالا اور ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے تین چار وار کر دیئے۔ ایک پڑوسی جو ابھی اپنے گھر پہنچے تھے، نئی خبر سُن کر مولوی جی سے ہمدردی جتانے اُن ہی کی طرف آ رہے تھے۔ مولوی جی کو خود کلامی کرتے اور بھینس کو پیٹتے ہوئے دیکھ کر اُنہیں محسوس ہوا کہ مولوی جی اِس وقت جذباتی حالت میں ہیں اور نہایت ہی غصے میں ہیں۔ قریب آ کر اُنہوں نے نہایت ملائمت سے پوچھا ''مولوی جی یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

مولوی جی نے جواب میں کہا ''اِس کو بھی وہیں بھیج رہا ہوں جہاں میرے بیٹے، بیٹیاں گئے ہیں۔'' پڑوسی دھیرے سے ہنسا اور کہا ''مولوی جی، یہ کبھی نہیں جائے گی۔ اِنسان وفادار نہیں ہوتے ہیں مگر غریب جانور وفادار ہوتے ہیں۔ آپ اِس بے زبان کو مت ماریئے۔'' اُدھر بھینس مار کھا کر ایک گول چکر کاٹتے ہوئے پھر اپنے تھان پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور مولوی جی کی طرف منہ بڑھا کر اُن کا ہاتھ چاٹنے لگی تھی۔ اُنہوں نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اُس کے آنسو بہہ کر نتھنوں تک پہنچ چکے تھے۔ ''جانے یہ کب سے اور کیوں رو رہی ہے؟ شاید گھر کے اُجڑ جانے کا سوگ منا رہی ہے۔'' مولوی جی کے دِل میں خیال آیا۔ اُنہوں نے اُس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ ڈالے اور دِل ہی دِل میں اُسے ڈھارس بندھائی ''مت رو! میری بھینس، مت رو! میں ہوں نا! اب اِس گھر میں ایک تُو ہی تو میری مونس رہ گئی ہے۔ میں اب تجھے کہیں نہیں بھگاؤں گا اور کبھی نہیں ماروں گا۔'' اور اِس خیال کے ساتھ ہی مولوی جی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

پڑوسی نے مولوی جی کی ڈھارس بندھائی۔ بھینس کے گلے میں رَسّہ ڈالا، پانی پلایا، گھاس ڈالی اور مولوی جی کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ اُن کی دِلجوئی کی اور بچوں

کے جلد سے جلد واپس آنے کی اُمید دلائی۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد مولوی جی اپنے گھر چلے آئے۔ شام کو پڑوس کے ایک گھر سے کھانا آپہنچا۔ مولوی جی نے کہا ''میرے لئے کھانا نہیں، زہر لاؤ، زہر! اب مجھ میں جینے کی تمنا باقی نہیں رہی ہے۔''

اِس طرح یہ معمول بن گیا تھا کہ مولوی جی کا کھانا کبھی ایک گھر سے تو کبھی دُوسرے گھر سے آنے لگا۔ مولوی جی اپنی بھینس کو کھلاتے پلاتے تھے۔ دُودھ پڑوسی کھا پی لیتے اور پڑوسیوں کے گھر کا کھانا مولوی جی کھا لیتے۔ خود اُن کا گھر اُن کو کاٹ کھاتا۔ تنہائی اور گھر کی ویرانی ہر وقت کچوکے لگاتی رہتی۔ مگر یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا۔ ایک آدھ فاقہ بھی لگتا۔ دُوسری بار کھانا مل جاتا۔ اپنے گھر میں نہ آٹا چاول تھا، نہ اناج اور نہ ہی مولوی جی کو کھانا پکانا آتا تھا۔

بچوں کو واپس لانے کی کوشش تو اوّل روز سے ہی جاری ہوگئی تھی مگر بار آور نہیں ہو پا رہی تھی۔ بچے بضد تھے کہ وہ اپنی امّاں کے پاس ہی رہیں گے اور اپنے گھر میں صرف اُسی وقت جائیں گے جب امّاں بھی اُن کے ساتھ جائیں گی مگر امّاں کیسے واپس آسکتی تھی؟ صبیحہ کا عین نکاح کے وقت گھر سے لاپتہ ہونا اور مولوی جی کا اپنی بیوی کو طلاق دینا، علاقے میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تو نہیں تھا مگر ایسے واقعات کی تشہیر علاقے بھر میں بہت زوروں سے ہوا کرتی تھی۔ دیہات بھر کے لوگ جانتے تھے کہ مولوی باسط علی غصہ میں آکر، بیسیوں لوگوں کے سامنے بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال چکے ہیں۔ چنانچہ بیوی کی واپسی کا سوال آسان نہیں تھا۔ البتہ مولوی جی اپنے بیٹے بیٹیوں کو واپس لاکر اپنا گھر آباد کرنا چاہتے تھے اور ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔ مولوی جی سخت تشویش میں تھے اور اُن کی صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ دِن کو مارے مارے پھرتے، کوئی غمگسار مل جاتا تو اُسے اپنے حالات و واقعات سناتے۔ رات کو گھر میں آکر تنہائی کا لبادہ اوڑھ کر پڑے رہتے۔ کسی گھر سے بھیجا ہوا کھانا کھا کر سونے کی کوشش کرتے۔ نیند نہیں آتی تو اُٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جاتے، دعائیں کرتے،

ہوئے تو تجھے میں نے کیا کرنا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے تیرا دُودھ۔ تُو بھی اُدھر ہی جا جہاں تیرے مالک گئے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے مولوی جی نے بھینس کے گلے سے رَسّہ نکالا اور ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے تین چار وار کر دئے۔ ایک پڑوسی جو ابھی اپنے گھر پہنچے تھے، نئی خبر سُن کر مولوی جی سے ہمدردی جتانے اُن ہی کی طرف آ رہے تھے۔ مولوی جی کو خود کلامی کرتے اور بھینس کو پیٹتے ہوئے دیکھ کر اُنہیں محسوس ہوا کہ مولوی جی اِس وقت جذباتی حالت میں ہیں اور نہایت ہی غصے میں ہیں۔ قریب آ کر اُنہوں نے نہایت ملائمت سے پوچھا "مولوی جی یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

مولوی جی نے جواب میں کہا "اِس کو بھی وہیں بھیج رہا ہوں جہاں میرے بیٹے، بیٹیاں گئے ہیں۔" پڑوسی دھیرے سے ہنسا اور کہا "مولوی جی، یہ کبھی نہیں جائے گی۔ اِنسان وفادار نہیں ہوتے ہیں مگر غریب جانور وفادار ہوتے ہیں۔ آپ اِس بے زبان کو مت ماریئے۔" اُدھر بھینس مار کھا کر ایک گول چکر کاٹتے ہوئے پھر اپنے تھان پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور مولوی جی کی طرف منہ بڑھا کر اُن کا ہاتھ چاٹنے لگی تھی۔ اُنہوں نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اُس کے آنسو بہہ کر نتھنوں تک پہنچ چکے تھے۔ "جانے یہ کب سے اور کیوں رو رہی ہے؟ شاید گھر کے اُجڑ جانے کا سوگ منا رہی ہے۔" مولوی جی کے دِل میں خیال آیا۔ اُنہوں نے اُس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ ڈالے اور دِل ہی دِل میں اُسے ڈھارس بندھائی "مت رو! میری بھینس، مت رو! میں ہوں نا! اب اِس گھر میں ایک تُو ہی تو میری مونس رہ گئی ہے۔ میں اب تجھے کہیں نہیں بھگاؤں گا اور کبھی نہیں ماروں گا۔" اور اِس خیال کے ساتھ ہی مولوی جی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

پڑوسی نے مولوی جی کی ڈھارس بندھائی۔ بھینس کے گلے میں رَسّہ ڈالا، پانی پلایا، گھاس ڈالی اور مولوی جی کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ اُن کی دِلجوئی کی اور بچوں

کے جلد سے جلد واپس آنے کی اُمید دلائی۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد مولوی جی اپنے گھر چلے آئے۔ شام کو پڑوس کے ایک گھر سے کھانا آپہنچا۔ مولوی جی نے کہا ''میرے لئے کھانا نہیں، زہر لاؤ، زہر! اب مجھ میں جینے کی تمنا باقی نہیں رہی ہے۔''

اِس طرح یہ معمول بن گیا تھا کہ مولوی جی کا کھانا کبھی ایک گھر سے تو کبھی دُوسرے گھر سے آنے لگا۔ مولوی جی اپنی بھینس کو کھلاتے پلاتے تھے۔ دُودھ پڑوسی کھا پی لیتے اور پڑوسیوں کے گھر کا کھانا مولوی جی کھا لیتے۔ خود اُن کا گھر اُن کو کاٹ کھاتا۔ تنہائی اور گھر کی ویرانی ہر وقت کچوکے لگاتی رہتی۔ مگر یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا۔ ایک آدھ فاقہ بھی لگتا۔ دُوسری بار کھانا مل جاتا۔ اپنے گھر میں نہ آٹا چاول تھا، نہ اناج اور نہ ہی مولوی جی کو کھانا پکانا آتا تھا۔

بچوں کو واپس لانے کی کوشش تو اوّل روز سے ہی جاری ہوگئی تھی مگر بار آور نہیں ہو پا رہی تھی۔ بچے بضد تھے کہ وہ اپنی امّاں کے پاس ہی رہیں گے اور اپنے گھر میں صرف اُسی وقت جائیں گے جب امّاں بھی اُن کے ساتھ جائیں گی مگر امّاں کیسے واپس آسکتی تھی؟ صبیحہ کا عین نکاح کے وقت گھر سے لاپتہ ہونا اور مولوی جی کا اپنی بیوی کو طلاق دینا، علاقے میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تو نہیں تھا مگر ایسے واقعات کی تشہیر علاقے بھر میں بہت زوروں سے ہوا کرتی تھی۔ دیہات بھر کے لوگ جانتے تھے کہ مولوی باسط علی غصہ میں آکر، بیسیوں لوگوں کے سامنے بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال چکے ہیں۔ چنانچہ بیوی کی واپسی کا سوال آسان نہیں تھا۔ البتہ مولوی جی اپنے بیٹے بیٹیوں کو واپس لاکر اپنا گھر آباد کرنا چاہتے تھے اور ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔ مولوی جی سخت تشویش میں تھے اور اُن کی صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ دِن کو مارے مارے پھرتے، کوئی غمگسار مل جاتا تو اُسے اپنے حالات و واقعات سناتے۔ رات کو گھر میں آکر تنہائی کا لبادہ اوڑھ کر پڑے رہتے۔ کسی گھر سے بھیجا ہوا کھانا کھا کر سونے کی کوشش کرتے۔ نیند نہیں آتی تو اُٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جاتے، دعائیں کرتے،

تنہائی سے پناہ مانگتے مگر اُن کی دعائیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔

وہ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کے شناساؤں اور قدردانوں میں اُن کے تئیں اب وہ پہلے جیسا اخلاق نہیں رہا ہے۔ اب کسی بھی جگہ اور کسی بھی گھر میں اُن کی وہ پہلے جیسی آؤ بھگت نہیں ہوتی ہے۔ مولوی جی کو یوں لگتا کہ وہ بے مقصد جی رہے ہیں۔

اُدھر کچھ عرصہ سے مولوی جی کو اپنے سسرال والوں کی طرف سے یہ دھمکیاں مل رہی تھیں کہ مولوی جی کے پانچ بیٹے' بیٹیاں اور ایک بیوی گزشتہ کئی مہینوں سے اُن کے گھر میں پل بڑھ رہے ہیں اور اب وہ مولوی جی پر خرچے کا دعویٰ کرنے جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے سسرال والوں پر اُن کے بیٹے بیٹیوں کو ورغلانے اور گھر کا ساز و سامان چوری کرنے کا اِلزام لگا کر مقدمہ دائر کرنے میں پہل کر دِکھائی۔ چند ہی دِنوں میں دو طرفہ مقدمہ چل پڑا۔ سچ جھوٹ کیا ہے؟ کھوج پڑتال ہونے لگی۔ دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کرنے میں ظاہر ہے عدالت کو وقت لگتا ہی ہے۔ مقدمہ طول پکڑتا گیا۔ تاریخیں طے ہوتی گئیں اور مولوی جی کے حق میں فیصلہ ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اِس بیچ اُنہوں نے ایک اور حربہ آزما ڈالا۔ اُنہوں نے یہ اعلان کر ڈالا کہ اگر میرے بیٹے بیٹیاں چند ہی دِنوں کے اندر اندر واپس نہیں آئے تو میں اپنی ساری زمین جائیداد اور مکان فروخت کر کے حج پر روانہ ہو جاؤں گا اور کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ مولوی جی کا خیال تھا کہ یہ حربہ ہر حال میں کامیاب رہے گا مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اُن کے بیٹے بیٹیوں نے کہلا بھیجا کہ ''کچھ بھی ہو جائے' گھر میں پہلے ہماری امّاں داخل ہوں گی اور بعد میں ہم بہن بھائی۔ نہیں تو ہم گھر گھر بھیک مانگ کر گزارہ کریں گے۔''

تب کچھ معتبر لوگ بیچ میں پڑے۔ مولوی جی کو سمجھایا ''بچوں کو دھمکیاں مت دو۔ اُن سے پیار کرو۔ اُن کی بھی سنو۔ داناؤں نے کہا ہے کہ بچے جب بڑے ہو جائیں تو اُن کو دوست بنا لو۔ اِس لئے جارحانہ رویہ چھوڑ دو۔ جو آپ کے بچے

چاہتے ہیں وہی کرو۔ پہلے ہی بچوں کی مرضی کو ملحوظ رکھا ہوتا تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ اب آپ کے گھر کے چھ افراد اُن کے ہاں رہ رہے ہیں۔ فیصلہ آپ کے حق میں ممکن نہیں لگتا اور مقدمہ لڑتے ہوئے شاید آپ کو اپنا آپ بھی بیچنا پڑے گا۔ اِس سے پہلے کہ عدالت کوئی فیصلہ کرے، آپ خود ہی فیصلہ کرڈالو۔ غصہ تھوک دو۔ یہ اِنسان کو بہادر کبھی نہیں بناتا ہے بلکہ ذِلیل وخوار ہونے پر مجبور کردیتا ہے۔ آپ خود ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ غصہ کی حالت میں طلاق کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔ آپ کی جس بیٹی نے گھر چھوڑا، وہ اپنا گھر بسا چکی ہے مگر آپ خود اپنا گھر اُجاڑے بیٹھے ہو۔ گزشتہ واقعہ کو بھول جاؤ اور بیوی کو گھر لے آؤ۔ بچوں کی خاطر ہی سہی۔"

مولوی جی تو لوگوں کی یہ باتیں سننے کے لئے جیسے ترس رہے تھے۔ وہ اپنے کیئے پر اندر ہی اندر سخت نادم تھے۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ کوئی اُنہیں بیوی کو گھر لانے کی بات کہے۔ چنانچہ اُسی نشست میں اُنہوں نے باآواز بلند کہا "میں آپ معتبر لوگوں کی باتیں مانتا ہوں اور تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا اور کہا، وہ غصہ کی حالت میں ہی تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ میری بیوی بالکل بے قصور ہے۔ میری بیٹی نے جو قدم اُٹھایا، وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اُٹھایا۔ یہ بعد میں اُس کا خط پڑھ کر مجھے معلوم ہوا۔ میں آپ سب کی موجودگی میں بیوی کو گھر آنے کی اِجازت دیتا ہوں۔"

اِجازت ملتے ہی بیوی مع اپنے پانچوں بیٹے بیٹیوں اور ساز وسامان کے چند سرپرستوں کی رہنمائی میں گھر میں آن وارد ہوئی۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح علاقے میں پھیلی اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے بیوی کو مولوی جی کے گھر میں بستے اور چلتے پھرتے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا؟ مانو سارے علاقے میں بھونچال آگیا ہو۔ ایک شور بلند ہوا۔ لوگ سر جوڑنے اور اُدھم مچانے لگے۔ غوغہ کرنے لگے۔ "اُف! غضب اللہ کا!"

"مولوی اور یہ اندھیر نگری۔"

"مولوی جی نے طلاق دے کر پھر سے بیوی کو گھر میں بُلا لیا؟"

''مولوی نے بغیر نکاح کے بیوی کو بسالیا!''

''مولوی سے سوشل بائیکاٹ کیا جائے۔''

اُس سے ملنا جلنا ترک کیا جائے۔''

''اُس کا حقہ پانی بند کیا جائے۔''

''اگر ہم چپ رہے تو اللہ کے دربار میں گنہگار کہلائیں گے۔'' غرض یہ کہ سارا گاؤں ایک جُٹ ہو گیا۔

مولوی جی نے تو سب کے گھر بسائے تھے۔ شادیوں میں نکاح پڑھوائے تھے۔ کئی خفیہ نکاح کروائے تھے۔ کچھ مصلحتوں کے تحت' کچھ کا حلالہ کروا کر گھر آباد کئے تھے مگر اب مولوی جی کا اُجڑا گھر پھر سے آباد کوئی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لوگوں نے مسجد میں نیا امام مقرر کرلیا۔ کسی بھی مذہبی عمل میں مولوی کو نکال باہر کیا جانے لگا۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ مولوی جی اگر گھر بسانا چاہتے ہیں تو شرعی تقاضے پورے کریں۔ چند پڑھے لکھے لوگوں نے مل کر مولوی جی کے سارے حالات و واقعات لکھ کر مفتی صاحب کو ارسال کر دیئے۔ اِسی بیچ مولوی جی نے بار بار یہ کہہ کر اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کی کہ صرف بچوں کو گھر میں آباد کرنے کے لئے اُن کی ماں اُن کے ساتھ رہ رہی ہے اور خود اُن کا بچوں کی ماں کے ساتھ کوئی تعلق قائم نہیں ہوا ہے۔

اب مولوی جی اپنی بات میں بھلے ہی سچے ہوں اور لاکھ بچاؤ کریں مگر یہ حقیقت تھی کہ وہی بیوی اُن کے گھر میں رہ رہی تھی جسے کچھ عرصہ قبل بہت سوں کی موجودگی میں اُنہوں نے طلاق طلاق کہہ کر گھر سے نکالا تھا اور بات مفتی صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ جلد ہی فتویٰ صادر ہوا۔ مولوی صاحب کو نہ صرف تعزیر ادا کرنی تھی بلکہ گھر بسانے کے لئے شرعی تقاضا پورا کرنا تھا ورنہ.........

اب کوئی چارا نہ تھا۔ اگر وہ بیوی کو گھر سے نکالتے ہیں تو ساتھ میں بچے بھی جاتے ہیں اور اُن کے ہاتھ پھر وہی ڈھاک کے تین پات! وہ خود مولوی تھے۔ جنت

کے دعویدار تھے اور اب پھر سے اپنی بسی بسائی جنت اُجاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا شرعی تقاضے پورے کرنے کے لئے بصد شوق تیار ہو گئے۔ وہی تقاضے جو اُن کے دیئے ہوئے فتووں پر علاقے کے چند لوگ پورے کر چکے تھے' اب اُنہیں وہی تقاضے خود پورے کرنے تھے۔

اب ضرورت تھی ایک مردِ مجاہد کی' ایک غازی کی۔ مگر بسیار کوشش کے باوجود کوئی مرد کا بچہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔ سب کے سب جیسے 'چھوئے موئے' ہوں۔ یہ تو مولوی جی ہی تھے جو اپنی پُر جوش اور پُر اثر باتوں سے کسی نہ کسی کو تیار کر لیتے تھے اور کسی کا اُجڑا ہوا گھر پھر سے آباد کر دیتے تھے۔ اب جبکہ مولوی جی کا اُجڑا دیار آباد کرنا تھا تو نہ کوئی غازی رہا تھا اور نہ کوئی مشتاق۔

بہر حال کوششیں جاری رہیں اور احتیاط کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ کئی نام گنے گئے۔ کچھ پر خود مولوی جی کو اعتراض تھا' کچھ قابلِ اعتبار اور قابلِ اعتماد تھے ہی نہیں۔ بھلا منہ آئی مِشری کی ڈلی کو نگلنا آسان ہوتا ہے کہ اُگلنا؟ پہلے سے ہی ایک دو واقعات رُونما ہو چکے تھے کہ کوئی غازی میدان میں کود تو پڑا مگر موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میدان پر ہمیشہ کے لئے اپنا قبضہ اور تسلط جما لیا اور فریقِ اوّل منہ دیکھتا رہ گیا۔

بہر حال مولوی جی دُور کی نظر رکھتے تھے' تجربہ کار تھے اور چوکس تھے۔ اب وہ کسی نئی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ آخر اَنتھک کوششوں سے ایک مجاہد کو ڈھونڈ نکالا گیا اور وہ بھی ایک شرط پر۔ اُس کی پہلی اور آخری شرط یہ تھی کہ اُس کا نام چرچا میں نہیں آنا چاہیے۔ کاغذی کارروائی اُس کے نام پر مکمل کی جائے مگر ساری کارروائی خُفیہ طور پر اِختتام پذیر ہو جائے اور اُس کا نام کبھی عام لوگوں تک نہ پہنچنے پائے۔

اُس کا نام قربان علی تھا۔ اُسے یقین دِلایا گیا کہ اُس کا نام خفیہ رکھا جائے گا اور وہ چرچا میں نہیں آئے گا۔ یوں قربان علی مولوی جی کی جنتِ ارضی کی بحالی کے لئے قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ تاریخ' جگہ اور وقت کا تعین ہوا۔ چند خیر خواہ' چند گواہ

اور نکاح خواں مقررہ تاریخ کے مطابق مقرر کردہ جلسہ پر موجود تھے۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی مگر نہ تو قربان علی اور نہ ہی مولوی جی کی مطلقہ بیوی وہاں پہنچ پائی تھی۔

قربان علی کو اپنے گھر سے نکلنے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ اِنتظار کر رہا تھا اپنی بیوی کے سونے کا مگر یہ بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگر رات کے کسی پہر بیوی کی آنکھ کھل گئی اور قربان علی کو گھر میں موجود نہیں پایا تو وہ ساری بستی کو جگا دے گی اور رات کے اندھیرے میں ہی مشعل لے کر اُسے ڈُھونڈنے نکل پڑے گی۔ صبح ہونے کا اِنتظار وہ کبھی نہیں کرے گی اور اگر وہ اُسے ہمراز بناتا ہے تو پھر وہ کہیں آنے جانے اور وعدہ وفا کرنے سے رہا۔ قربان علی سخت اُلجھن میں پڑا تھا۔

اُدھر مولوی باسط علی مطلقہ بیوی کی منتیں کر کے تھک ہار رہے تھے مگر نکاحِ ثانی کے لئے وہ کسی طور بھی مان نہیں رہی تھی۔ مولوی جی اُسے بار بار سمجھا رہے تھے کہ عبرت کے لئے یہ سب ضروری ہے۔ ہمیں پھر سے ایک ساتھ رہنے کے لئے اِس اِمتحان سے گزرنا ہوگا۔ بیوی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔

خیر خواہوں نے کافی اِنتظار کے بعد دونوں گھروں کی طرف ایک ایک آدمی روانہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد قربان علی لوئی میں منہ چھپائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور آدھ گھنٹے کے مزید اِنتظار کے بعد مولوی جی کی بیوی خود کو سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹے، تھکے ماندے قدموں سے وہاں پہنچ گئی۔ گھر والوں نے سبھی کو چائے پیش کی۔ چائے کے فوراً بعد نکاح پڑھوایا گیا اور لوگ اُٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ قربان علی سب سے پہلے گھر سے باہر نکل آیا اور اپنے گھر کی طرف لپکا۔ ایک دو آدمیوں نے اُسے سامنے سے گھیر کر پکڑ لیا۔ اُس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور اُسے کچھ سمجھا کر کمرے کے اندر دھکیل دیا۔

مولوی جی کی بیوی کے لئے وہ رات، اُس رات سے بھی کہیں زیادہ کٹھن، طویل اور تاریک ہو گئی تھی، جس رات صبیحہ گھر سے فرار ہوئی تھی اور جس رات مولوی جی

نے اُسے طلاق، طلاق کہہ کر گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ رات بھر وہ دُعا مانگتی رہی۔
''یارب! کسی بھی عورت کی زِندگی میں یہ رات کبھی نہ آئے۔''

قربان علی کی زِندگی میں پہلی بار یہ اِنتہائی مشکل، سخت ترین اور صبر آزما رات آئی تھی۔ نیند اُسے آنہیں رہی تھی اور صبح ہو نہیں رہی تھی۔ رہ رہ کر اُسے بیوی کا خیال آرہا تھا کہ وہ اُسے ڈھونڈ رہی ہوگی اور صبح ہونے پر اُس کی خیر نہیں ہوگی۔

وہ تو رات کو ''میں گیا اور آیا'' کہہ کر گھر سے ایک دم نکل آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کچھ ہی دیر بعد گھر لوٹ آئے گا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ مولوی باسط علی کے خیر خواہ اُسے کمرے کے اندر بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دیں گے۔ وہ کئی بار باہر نکلنے کے لئے اُٹھا مگر رات بھر دروازہ باہر سے بند ہی رہا۔ اُسے لگتا تھا کہ گھر کے مکیں بھی اِس سازش میں شامل ہیں۔ رات بھر وہ اُن سب لوگوں کو دِل ہی دِل میں گالیاں بکتا رہا۔

رات کے آخری پہر اُسے یوں لگا جیسے باہر سے کسی نے کنڈی کھول دی ہو۔ چند لمحے وہ کسی کے اندر آنے کا منتظر رہا۔ پھر اُٹھا اور آہستہ سے دروازہ کھولا تو وہ فوراً ہی کھل گیا۔ اُس نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک مدّت بعد جیل سے نکل بھاگا ہو۔

○○○

تین وارداتیں

پہلی واردات:

زمین کے تنازعے کو لے کر تینوں بھائی یکا یک ہی لڑ پڑے۔ دو کے مقابلے میں ایک بھائی لڑتے بھڑتے سر میں پتھر کی چوٹ کھا کر ڈھیر ہو گیا۔

''اوہ! میں تو اِسے ڈرا رہا تھا، مگر یہ تو مرنے لگا ہے۔ ذرا دیکھو تو!''

''ارے ہاں! یہ تو مر گیا۔ اب کیا ہوگا؟''

''اچھا ہوا۔ اِس کی حصّہ داری سے ہماری جان تو چھوٹی۔''

''مگر ہم جیل میں بند بھی رہیں گے؟''

''ہرگز نہیں!''

''وہ کیسے؟''

''یہ ہمیں ایک لاکھ روپے دے کر جا رہا ہے۔''

''مگر کہاں سے؟ اِس کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔ لاکھ روپے کا مالک ہوتا تو اِس کی بیوی گھر چھوڑ کر کیوں بھاگتی۔''

''اب سرکار دے گی ہمیں۔ یہ ملی ٹینسی ہمارے اور کس کام آئے گی۔''

''واہ! اب میں سمجھ گیا۔ بڑا دھنی نکلا ہے یہ۔ اپنے حصّے کی زمین کے ساتھ ساتھ ایک لاکھ بھی دے کر جا رہا ہے۔ آخر اپنا بھائی ہی تو ہے....... بھلے ہی الگ ماں سے ہے۔''

''بس بس' زیادہ خوشی نہ منا۔ جلدی سے چھری' چاقو کا بندوبست کر۔''

''وہ کس لئے؟''

''مخبری کرنے والوں کے گلے کاٹے جاتے ہیں۔ اُن پر گولیاں ضائع نہیں کی جاتی ہیں۔''

''ارے ہاں! مگر یہاں کھیت میں چھری چاقو کہاں؟ درانتی ہے درانتی' جو میں گھاس کاٹنے کے لئے ساتھ لایا تھا۔''

''جلدی سے لے آ......!''

''یہ دیکھو۔ کچھ خون بھی بہہ نکلا ہے۔''

''اب.....؟''

''اب لاش پر گھاس پھوس ڈال کر دُور ہٹ جاتے ہیں اور رات کے وقت یہاں سے اُٹھا کر نالے کے اُس پار سڑک کے کنارے پھینک آئیں گے۔ مگر دیکھو کوئی ہمیں کہیں سے دیکھ تو نہیں رہا ہے؟''

''یہاں تو دُور دُور تک بھی کوئی نہیں ہے مگر کہیں سے کوئی ہمارا عینی گواہ نکل آیا تو.........؟''

''تو بھی فکر کی بات نہیں۔ ایک لاکھ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لاکھ میں سے صرف چند ہزار دے کر اُس کا منہ بند کر دیں گے۔''

''واہ! بہت ہوشیار اور دِماغ والے ہو۔ کاش تم پڑھے لکھے بھی ہوتے تو تمہاری قابلیت کی کوئی حد نہ ہوتی۔''

''ارے ہاں' یاد آیا۔ لاش کے پاس ایک رقعہ بھی رکھنا پڑے گا۔ کیا تم لکھ سکو گے.......؟''

''ہاں! ٹیڑھی میڑھی چند سطریں لکھ ہی لوں گا۔ آخر پانچ جماعتیں اسکول میں پڑھا ہوں۔''

دُوسری واردات:

علاقے میں پھیلی مِلی ٹنسی کی روک تھام کے لئے رات کے وقت گشت پر نکلی گشتی پارٹی نے علاقے میں نقل و حرکت دیکھی اور چوکس ہوگئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد تڑتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ رات کے سناٹے میں چلنے والی گولیوں کی آوازیں سن کر اپنے گھروں اور بستروں میں سوئے ہوئے لوگوں کے جسم تھرتھرا اُٹھے۔

صبح ہوئی تو خبر پھیلی کہ رات کی فائرنگ میں تین دہشت پسند مارے گئے جب کہ دیگر کئی بھاگ نکلے۔ اُن کو پکڑنے کے لئے آرمی نے سارے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور گھر گھر تلاشی ہو رہی ہے۔

کچھ ہی دیر کے بعد پولیس مارے گئے دہشت پسندوں کی لاشیں اُٹھوانے کے لئے کچھ سیویلین کو ساتھ لے کر جائے واردات پر پہنچی اور لوگوں نے دیکھا اور پہچانا کہ مارے جانے والے تو اِسی گاؤں کے رہنے والے تینوں بھائی ہیں۔

پولیس نے پنچ نامہ میں ایک حیرت کن اِنکشاف کیا کہ تینوں لاشوں میں سے ایک کا گلا کند ہتھیار سے کٹا ہوا تھا۔ اُس کے جسم پر گولیاں لگنے کے نشانات تھے مگر خون نہیں نکلا تھا، جبکہ دو لاشیں خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔

تیسری واردات:

بے گناہ سیویلین کی ہلاکتوں پر مقامی لوگ مشتعل ہو کر سڑک تک پہنچ آئے۔ نعرہ بازی ہوئی۔ ٹریفک جام ہوا۔ پہلے لاٹھیاں چلیں پھر فائرنگ ہوئی۔ پانچ لوگ زخمی ہوئے، ایک اور ہلاک ہوا۔ تب کہیں جا کر ٹریفک بحال ہوا۔

○○○

وہ کون تھا؟

رات کے دس بج رہے تھے۔ صائمہ اپنے کمرے میں چوری چھپے ایک ادبی میگزین کھولے بیٹھی تھی۔

راحت اِجازت ہی نہیں دیتے تھے رات کولائٹ جلانے کی۔ خود بھی وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی مگر کرتی بھی کیا؟ دِن بھر زِندگی کی چھوٹی چھوٹی بے شمار مصروفیات اور رات خوفناک! مگر شوق تھا کہ ہر خطرے پر غالب آنے کو بیتاب تھا۔

کتنے ہی دِنوں اور مہینوں بلکہ کئی سالوں سے وہ یکسوئی سے مطالعہ نہیں کر پائی تھی۔ کتابیں پڑھنے کا اُسے چسکا سا پڑ چکا تھا۔ کتابوں میں ڈُوب کر وہ ایک نئی معلوماتی اور دلچسپ دُنیا سے روشناس ہو چکی تھی اور وہ اِس قول کا مطلب بخوبی سمجھ چکی تھی کہ کتابیں اِنسان کی بہترین دوست ہوتی ہیں۔ وہ اگر نہیں پڑھ پاتی تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس نے کوئی کام ہی نہ کیا ہو۔ جیسے اُس کے شب و روز بے کار ہی گزر رہے ہوں۔

آج صبح سے ہی اُس نے رات کو کم سے کم ڈیڑھ دو گھنٹے تک پڑھنے کا پروگرام اور ماحول اُستوار کرلیا تھا۔ اُس نے گھر کے اُس چھوٹے کمرے کا اِنتخاب کیا تھا جس میں صرف دو پٹ والی کھڑکی تھی۔ کھڑکی اور دروازے کی درزوں میں اُس نے چکنی مٹی گوندکر بھرڈالی تھی۔ روشن دانوں کے شیشوں پر دوہرے اخبار چسپاں کیے اور موٹے کپڑے کے پردے لٹکا دیئے۔ کمرے کا بلب جلانے کے بجائے اُس نے ٹیبل لیمپ جلانے میں عافیت جانی۔ تھوڑا سا اور تار جوڑ کر بورڈ میں اُس کا کنکشن جوڑا اور

کونے میں ٹیبل لیمپ فٹ کر دیا۔ کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ کواڑ چیخ رہے ہیں۔ اُس نے سلائی مشین میں تیل ڈالنے والی کُپی تلاش کی اور چیخ رہے کواڑوں کے قبضوں میں تیل ٹپکا دیا اور پھر اچھی طرح کھولا اور بند کر کے دیکھا۔ رات کے سناٹے میں جب کسی ضرورت کے تحت ایک کمرے سے دُوسرے کمرے میں جانا پڑتا تو کواڑوں کی چیخ و پکار بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اب وہ آواز نہیں کرر ہے تھے۔ اِس سارے اہتمام سے اُس نے راحت کو بے خبر ہی رکھا۔ پہلے تو اُس نے خود اپنے حوصلے کو ہی پرکھنا تھا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد معمول کی طرح اُس نے بغیر آواز پیدا کیے جلدی جلدی برتن دھوئے۔ رسوئی کی صفائی کی اور پھر لائٹ آف کر کے اندازے سے ہی بیڈروم میں جا پہنچی۔ اندھیرے میں راحت کی بیڑی اور ریڈیو کا انڈیکیٹر جگنو کی طرح چمک رہے تھے۔ بیڑی ایش ٹرے میں بجھا کر راحت نے اپنے اُوپر کمبل اوڑھتے ہوئے معمول کی طرح صائمہ سے کہا۔ ''اگر میں سو گیا تو ریڈیو بند کر دینا۔''

رات کی مصروفیات، بس سرہانے رکھے ریڈیو سے دھیمی آواز میں بلکہ نہایت ہی دھیمی آواز میں خبریں سننے تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ ٹیلی ویژن کب سے بند پڑا تھا۔ راہب جب گھر میں تھا تو وہ ضد کر کے دھیمی سی آواز میں آن کر ہی دیا کرتا تھا۔

''کچھ نہیں ہوگا مما، ڈیڈی۔ آپ یوں ہی بس۔ وہ آواز یا لائٹ دیکھ کر نہیں بلکہ اپنے پروگرام اور پری پلاننگ سے آتے ہیں۔ اُس بار بھی تو ہم سب سوئے تھے۔ ٹیلی ویژن بند تھا۔ بلب بند تھے اور وہ......''

اُس رات راحت اور صائمہ چونک اُٹھے تھے۔ راہب کو کیوں کر معلوم ہوا کہ وہ آواز اور لائٹ دیکھ کر نہیں، اپنے پروگرام اور پری پلاننگ سے آتے ہیں۔

گاؤں کے تین چار گھروں کے نوجوان لڑکے لاپتہ ہو چکے تھے۔ گھر والوں کا کہنا تھا کہ پنجاب گئے ہیں کمائی کرنے کے لئے یا کشمیر گئے ہیں۔

مگر کشمیر؟ ہوں؟ آج کل کے حالات میں کشمیر جاتا ہی کون ہے؟ اور پنجاب کیوں جائیں گے؟ اب وہ وقت تو نہیں رہا کہ گاؤں کے اکثر لوگ اور بالخصوص جوان ہوتے لڑکے گھر کی خستہ حالت اور غربت سے تنگ آکر پنجاب اور کشمیر کا رُخ کیا کرتے تھے۔ کچھ کما کر لاتے تھے اور کچھ کی لاشیں آتی تھیں اور کچھ وہیں کے ہو کر رہ جاتے تھے۔ مگر اب وہ حالات نہیں تھے۔ اب گاؤں خوشحال تھے۔ لوگ بھی خوشحال تھے۔ دورِ جدید کی سہولتیں ہر گاؤں میں موجود تھیں۔ پھر کوئی کیوں......؟ اُس رات سوچ اور فکر میں ڈُوبے رہنے کے بعد راحت نے صائمہ سے کہا۔ ''تم راہب سے اُگلواؤ۔ وہ کسی غلط سنگت میں تو نہیں پڑ گیا ہے؟ اُسے کیسے معلوم ہوا ہے کہ وہ.........''

''چوبیس گھنٹے نظروں میں ہی تو رہتا ہے۔ اڑوس پڑوس میں بھی کہیں نہیں جاتا ہے۔ اسکول سے سیدھے گھر آجاتا ہے۔ سوچ بھی اچھی رکھتا ہے۔ دُوسروں کو ہدایتیں دیتا ہے۔ اپنے لئے تو کہتا ہے کہ آرمی آفیسر بنوں گا۔ سپاہی بننے پر تو آمادہ ہی نہیں ہوتا ہے۔'' صائمہ نے تھوڑی سی وکالت کی۔

راحت دِل ہی دِل میں فتح یابی کے احساس سے مسکرائے اور کہا۔ ''پھر بھی ہمیں چوکس رہنا ہوگا۔ کچے ذہنوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا ہے۔ ویسے اِن حالات میں راہب کا گھر میں رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔''

''ہاں' دوطرفہ خطرہ ہے۔ جب بھی کوئی آتا جاتا ہے تو مجھے راہب کی فکر لگتی ہے.....'' صائمہ نے فکرمندی سے کہا۔

''تو پھر کیوں نا ہم راہب کا شہر کے کسی اسکول میں داخلہ کروادیں۔ وہ شہر میں ہی رہے اور وہیں پڑھے لکھے۔ یہاں اُس کی پڑھائی بھی ٹھیک سے نہیں ہو پا رہی ہے اور ہم چوبیس گھنٹوں کی فکرمندی سے بھی بچ جائیں گے۔''

اِس فیصلے کے بعد راہب کو شہر منتقل کر دیا گیا تھا اور تب سے ہی ٹیلی ویژن بے مصرف سی چیز بن کر رہ گیا تھا۔ ریڈیو پر مقررہ اوقات میں بس خبریں ہی سنی جاتی

تھیں اور وہ بھی نہایت ہی دھیمی آواز میں۔

صائمہ نے راحت کی سانسوں سے اندازہ لگایا کہ اب وہ سو گئے ہیں۔ چھوٹے بچے بھی سو چکے تھے۔ اُس نے ریڈیو بند کر دیا۔ کچھ دیر اِنتظار کیا اور پھر دبے پاؤں درمیانی دروازے سے گزر کر چھوٹے کمرے میں پہنچ گئی۔ ٹیبل لیمپ آن کیا اور پڑھنے میں مشغول ہوگئی مگر یکسوئی کے بجائے کھٹکا دو طرفہ، گھر کے اندر کا بھی اور باہر کا بھی۔ پھر بھی وہ دھڑکتے دِل سے گھنٹہ بھر ورق گردانی کرتی رہی اور اب نیند اُسے گھیرنے لگی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کہیں پکڑی جائے، اُس نے سونے کو ترجیح دی۔

کچھ دِن بھر کی تھکاوٹ اور اُس سے زیادہ اپنے ذوق کی تسکین کے خوشگوار احساس تلے وہ نیند کی گہرائیوں میں اُتری ہی تھی کہ سامنے والے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ وہ تڑپ کر جاگی۔ اُس کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''ہائے! اِس وقت فون کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ میکے والوں میں سے بھی آج تک کسی نے رات کے وقت فون نہیں کیا۔ اُٹھاؤں یا نہیں! شاید کوئی اپنا ہی ہو۔''

اُس نے دھڑکتے دِل اور کانپتے ہاتھ سے رسیور اُٹھا کر کان سے لگالیا۔

''اسلام علیکم۔'' دُوسری طرف سے دھیمے سے لہجے میں آواز آئی۔

''وعلیکم السلام، آپ کون ہیں؟'' صائمہ نے جلدی سے پوچھا۔

''ہم بتا نہیں سکتے ہیں۔'' نپا تُلا اور ملائم و مدھم سا لہجہ تھا۔ صائمہ کا دِل اور تیزی سے دھڑک اُٹھا، جس کی دھڑکن فون پر دُوسری طرف سنی بھی جا سکتی تھی۔

''آپ، آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟''

''ہم یہ بھی نہیں بتا سکتے۔ کیا آپ نے ہمیں پہچانا نہیں؟''

''جی نہیں!'' صائمہ نے مری سی آواز میں جواب دیا۔

''ہم آپ کے ہاں رہ آئے ہیں گزشتہ سال۔ آپ ہمیں اپنے گھر کے اندر بند کر کے تالا لگا کر بھاگ نکلے تھے۔ اب یاد آیا؟''

صائمہ کو سال بھر پہلے رُونما ہونے والا وہ واقعہ اور ایسے ہی کئی اور واقعات زندگی بھر بھولنے والے نہیں تھے۔ وہ خوف و ہراس، وہ بھاگ دوڑ، وہ گرنا اور پاؤں میں موچ آنا، پھر بخار میں مبتلا ہو کر کئی دِن تک بستر پر پڑے رہنا اور اُس کے بعد کی کارروائی۔ اُف اللہ کی پناہ!

صائمہ کو سب کچھ یاد تھا اور اب تو فون بند کرنا اور بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ پھر بھی اُس نے احتیاط کے طور پر اور نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''جی! آپ یقینی طور پر رانگ نمبر پر بات کر رہے ہیں۔ ہمارے.......''

''بالکل نہیں!'' وہ جھٹ بول اُٹھا۔ ایک دم بدلے ہوئے لہجے میں۔ ''میں وصی ہوں، راحت کہاں ہیں؟''

''جی وہ دُوسرے کمرے میں ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے صائمہ نے دُعا کی۔

''یا اللہ ہمیں بچانا۔''

''اُنہیں جگاؤ۔'' دُوسری طرف سے بولنے والے کا لہجہ اب تحکمانہ تھا۔

''وہ سوئے ہیں۔ اب کیسے جگاؤں؟'' فون پر بولنے کی وجہ سے صائمہ نے اِتنی ہمت جٹا ہی لی تھی۔ اگر رُوبرو ہوتی تو کہتی۔ ''جی، جی، میں ابھی جگاتی ہوں۔''

''سوئے ہیں تو کیا ہے؟ ہم رات بھر جاگتے ہیں۔ اُن سے کچھ کام ہے۔'' لہجہ نہایت سخت تھا۔ ''جی، جی ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے صائمہ نے ریسیور ایک طرف رکھ دیا اور راحت کو جگا کر ساری بات سُنا دی۔

''تم نے فون اُٹھایا ہی کیوں تھا؟'' راحت غصے میں بولے۔ راحت کی نیند ایک دم سے غائب ہو چکی تھی اور گھبراہٹ صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بڑی عجلت سے بستر سے اُترے اور دُعائیں مانگتے ہوئے دھڑکتے دِل سے فون اُٹھالیا۔ اب کے دونوں میں جو باتیں ہوئیں، صائمہ بخوبی سمجھ گئی کہ ہم سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ اُس نے سرگوشی میں راحت سے کہا ''فون بند نہیں کرنا۔ مجھے دینا۔''

کئی دِنوں سے صائمہ کی ہتھیلیوں میں کھجلی ہو رہی تھی۔ اُس وقت بھی اُسے زوروں کی کھجلی ہوئی۔ اُس نے ناخنوں سے دونوں ہتھیلیوں کو رگڑتے ہوئے سوچا" یہ کھجلی یوں ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اب کوئی نئ مصیبت آئی کہ آئی۔ ہم بہت کچھ کھونے والے ہیں اب۔"

راحت فون پر بہت اِنکار کر رہے تھے، اپنی مجبوری بتا رہے تھے۔ اپنے پاس کچھ نہ ہونے کی دہائی دے رہے تھے مگر لگتا تھا کہ دُوسری طرف اُن کی بات مانی نہیں جا رہی ہے۔ آخر راحت نے کہا۔" آپ صائمہ سے پوچھ لو جو میرا یقین نہیں ہے......" اور رسیور صائمہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

صائمہ نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"جی، آپ کے جتنے بھی کام ہیں نا، اُن میں یہ کام سب سے آسان ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم اِس وقت بالکل خالی ہاتھ ہیں اور ایک لاکھ روپے کے مقروض بھی ہیں۔ آپ یقین کریں۔ آپ کو معلوم نہیں ہوگا کہ ہم نے ابھی ابھی مکان بنوایا ہے بینک سے اُدھار لے کر۔ ہماری آدھی سے زیادہ تنخواہ بچوں کی پڑھائی پر لگ جاتی ہے۔ باقی میں ہم بمشکل گزارہ کرتے ہیں۔" صائمہ نے ایک ہی سانس میں بولتے ہوئے لگ بھگ دُہائی دے ڈالی۔

"ہم آپ کو دُگنے واپس کریں گے۔ صرف ایک مہینے کی ہی تو بات ہے۔" دُوسری طرف سے بات کرنے والے کے لہجے میں بڑی اپنائیت اور نرمی تھی۔

"نہیں! نہیں! ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔ ہماری پرابلم بس یہ ہے کہ اِس وقت ہم بالکل خالی ہاتھ ہیں۔" صائمہ نے ملتجانہ انداز میں کہا۔

"کسی سے اُدھار لے لیجئے۔"

"مگر ہم کس سے اُدھار لیں؟ اُدھار تو کوئی اپنوں سے ہی لے سکتا ہے نا اور اپنوں میں ہمارا یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ کسی اور سے مانگیں گے تو وہ وجہ پوچھے گا اور پھر

اِتنی بڑی رقم دیتا ہی کون ہے۔''

''یہ آپ کو ہی معلوم کرنا ہے۔ ہم اِس وقت بے بس ہیں۔ جیسے بھی ہو' آپ بندوبست کریں۔ کل شام پانچ بجے ہمارا آدمی آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔'' ساتھ ہی زوردار آواز سے فون کٹ گیا۔

صائمہ نے رسیور ہاتھ میں پکڑے ہوئے خالی خالی نظروں سے راحت کو دیکھا۔ راحت نے جھٹ سے پوچھا'' کیا کہا اُس نے؟''

''کہہ رہا ہے کہ کل شام پانچ بجے آدمی پہنچ جائے گا۔'' کچھ دیر تک دونوں پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر صائمہ بولی'' دیکھا اِن لوگوں کا طریقہ! سوچتے ہوں گے جیسے ہمارے پاس نوٹوں کے بیگ بھرے رہتے ہیں۔ اِسی طرح اور لوگوں کے پاس بھی ہوں گے۔'' صائمہ غصے میں بڑبڑانے لگی۔ راحت سوچوں میں گم ہوگئے۔

''یارب! اب یہ نئی مصیبت ہمارے لئے باقی تھی۔ اگر دُوں تو بھی مارا جاتا ہوں۔ اگر نہیں دُوں تو بھی مارا جاتا ہوں اور پھر اِتنی بڑی رقم کا اِنتظام کہاں سے کروں؟ پچھلی بار بھی راستہ دِکھانے کے لئے ساتھ نہ چلنے پر اُن لوگوں نے بُری طرح مجھے پیٹ ڈالا تھا۔ اب کے اگر میں اُن کو رقم نہیں دے پایا تو وہ مجھے جان ہی سے مار دیں گے۔ اے اللہ! میری مدد کر۔ مجھ پر رحم کر!''

صائمہ نے راحت کے چہرے پر کرب کی سی حالت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''دیکھ لیا نا فون لگوانے کا انجام؟ فون لگواؤ' فون لگواؤ۔ سب کے گھر میں فون ہیں۔ ہمارے گھر میں فون نہیں۔ لو اب تمہارے گھر میں بھی فون ہے۔ اب تم ہی نپٹو اِن لوگوں سے!'' راحت نے غصے سے کہتے ہوئے ماچس پر زور سے دِیاسلائی رگڑی اور بیڑی سُلگالی۔ بند کمرے میں بیڑی کے دُھویں کے مرغولے دھیرے دھیرے حرکت کرنے لگے۔ کمرے میں بلب کی تیز روشنی تھی مگر اِس بات کا ڈر اور خیال تک نہ

تھا کہ لائٹ دیکھ کر کوئی راہ چلتا ہوا دستک دے سکتا ہے۔ ذہنوں پر اِس وقت ایک بڑے خطرے کا بوجھ تھا۔ راحت کی ناراضگی بھری باتوں کا جواب دینے کا موقعہ و محل نہ پا کر صائمہ دِل ہی دِل میں کھولنے لگی۔

''ہنھ! فون کے جو فائدے ہیں اُن سے آپ نا آشنا نہیں ہو۔ راہب کی اور اپنوں کی خیر خیریت ملتی ہے اور پھر فون کا زیادہ اِستعمال تو خود کرتے ہو۔ وہ بات بھول گئے ہو جب پڑوس کے گھر سے فون کرنے کے لئے دس بار سوچنا پڑتا تھا۔ وہ بات بھی بھول گئے ہو جب پڑوسن نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔ ''سہیل کالیس نوٹ کرتے رہا کرو۔'' پھر بھی ناراضگی مجھ پر کہ فون میں نے لگوایا۔ اگر فون نہیں ہوتا تو کیا معلوم اِس وقت وہ لوگ خود گھر میں موجود ہوتے۔ تب پتہ چلتا نا۔ جب فون نہیں تھا تو کیا تب اُن کے معاملات نہیں تھے؟ ہنھ! آج فون پر اِنکار تو کیا ہے نا۔ رُوبرو ہوتے تو ہاں جی' ہاں جی کہتے اور ''نہ'' کہنے کی رائی برابر ہمت نہ پڑتی۔ مجھ پر ناراض ہوتے ہیں۔ جیسے میں نے ہی اُنہیں کہا ہے کہ ہمیں فون کرو اور مانگو۔''

یہ حقیقت تھی کہ گھر میں فون کی سخت ضرورت تھی۔ سب ہی گھر والے چاہتے تھے کہ فون لگے۔ فون سننے کے لئے اور فون کرنے کے لئے بار بار پڑوسیوں کے ہاں جانے سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ کچھ ہی سال پہلے گاؤں والوں کو حکومت کی طرف سے فون کی سہولت حاصل ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں نے خوشی خوشی اپنے گھروں میں فون لگوائے تھے مگر اب فون کے حوالے سے ہونے والے کچھ واقعات اور حالات اِس بات کی اِجازت نہیں دیتے تھے کہ اپنے گھر میں بھی فون ہو۔ بہت سے لوگ اپنے فون کٹوا بھی چکے تھے۔ راحت فون لگوانے کی خواہش کو دو سال تک ٹالتے رہے۔ آخر صائمہ کے کہنے پر اُنہوں نے فون لگوا ہی لیا تھا اور اب فون لگے صرف چار ہی ماہ ہوئے تھے کہ فون کے حوالے سے آج اُن کے ساتھ دُوسرا واقعہ رُونما ہوا تھا۔ کچھ دیر تک دونوں چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھ کر بیڈ روم میں چلے گئے۔ راحت نے پاس

رکھا پانی کا گلاس اُٹھا کر پانی پیا اور پھر سے بیڑی سُلگا لی۔ ایک دو کش کھینچنے کے بعد راحت نے صائمہ سے کہا۔ ''اچھا کیا جو تم نے فون اُٹھایا اور سُنا۔''

''ابھی تو آپ ناراض ہو رہے تھے کہ فون اُٹھایا ہی کیوں تھا۔'' صائمہ نے بوجھل لہجے میں ناراضگی جتاتے ہوئے کہا۔

اب راحت کا موڈ پہلے سے بہتر تھا۔ اُس نے صائمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بھئی اُٹھانا تو پڑتا ہے، پہلے سے پہلے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کا فون ہے۔ کیا پتہ فون نہیں اُٹھاتے تو وہ خود یہاں پہنچ جاتے۔ صرف یہ معلوم ہونے پر کہ یہ اُن لوگوں میں سے کوئی ہے، تو سُنے بغیر فون ہی بند کر دینا چاہیے تھا۔ مگر نہیں! ایسا کرنا زیادہ مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔'' راحت نے اپنی بات کی خود ہی تردید کرتے ہوئے کہا۔

''بعد میں وہ لوگ پٹائی کرتے ہیں کہ ہم نے فون کیا اور تم نے سُنا نہیں۔ وحید کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے اُس کے ہاتھ اور ٹخنے سوجھے ہوئے دیکھے تھے۔''

''کب؟'' صائمہ نے خوفزدہ ہوتے ہوئے چونک کر پوچھا۔

''اب رہنے بھی دو۔ تمہارے لئے بس اِتنا ہی کافی ہے۔ ایسی باتوں کی کھوج میں نہ جایا کرو۔'' راحت نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

صائمہ پھر اندر ہی اندر کڑھنے لگی۔ ''ہنھ! ہر بات مجھ سے چھپاتے ہیں جیسا کہ میں اوروں سے یہی باتیں کرتی رہتی ہوں۔''

وہ چھوٹی کو اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گئی مگر نیند کوسوں دُور تھی۔ کتنی ہی دیر وہ دونوں سوچوں میں ڈوبے جاگتے رہے اور پھر اِن دُعاؤں کے ساتھ کہ ''یا اللہ! اِس بار بھی ہمیں آنے والی مصیبت سے بچانا'' آدھی رات کے قریب کہیں نیند اُن پر مہربان ہوگئی۔

صبح ہونے پر صائمہ کی آنکھ کھلی تو رات والا واقعہ اُس کے حافظے میں نہیں

تھا۔ اُس نے معمول کی طرح چین کی سانس لی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ آج کی رات بھی بخیر و بخوبی گزر گئی۔ نہ ہی کوئی دستک سنائی دی، نہ ہی کہیں سے کوئی فائرنگ یا دھماکے کی آواز سنائی دی۔

ہاں! طبیعت میں کچھ کسلمندی ضرور تھی۔ ابھی اُس کا اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور اُسی لمحے رات والا واقعہ اُس کی یادداشت سے آٹکرایا اور اُس کا دِل دھک سے رہ گیا۔ "اوہ! وہ کس خوشی میں ہے؟" صائمہ نے دِل ہی دِل میں خود سے کہا۔

"اُس نے شام پانچ بجے تک وقت دیا ہے۔ اِس وقت بھی پانچ ہی بج رہے ہوں گے۔ ہمارے پاس بارہ گھنٹے کا وقت ہے۔ اِنھی بارہ گھنٹوں میں ہمارے ساتھ کچھ آر یا پار ہونے والا ہے۔"

عافیت بھری ایک اور رات گزرنے کے بعد ہونے والی صبح کی خوشی اب زائل ہو چکی تھی۔ معمول کی طرح نہ چائے بنائی گئی، نہ ریڈیو پر خبریں سُنی گئیں اور نہ ہی چھوٹے بچوں سے لاڈ پیار ہوا۔ مایوسیوں نے گھر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے اور سب کچھ ایک دم سے پھیکا پھیکا سا ہو گیا تھا۔

راحت بغیر چائے کے ڈیوٹی پر چلے گئے۔ صائمہ دُعائیں مانگنے بیٹھ گئی۔

"یارب! ہمارے سر پہ پڑی مصیبت ٹال دے۔ اُن لوگوں پہ کوئی ایسی اُفتاد ڈال کہ وہ ہمارے پاس نہ آپائیں۔ یارب! اُن کے اپنے پیسے پہنچ جائیں تاکہ اُنھیں ہماری ضرورت ہی نہ رہے۔"

راحت ڈیوٹی پر تو گئے مگر کام میں دِل نہ لگا۔ بس بیڑیاں پھونکتے رہے۔ ساتھیوں نے وجہ پوچھی تو صحت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ کیا اور چھٹی لے کر گھر چلے آئے۔ صائمہ نے جو دیکھا تو دِل زور سے دھڑکنے لگا۔

"جانے کیا واقعہ ہوا ہے؟" راحت کے قریب پہنچتے ہی اُس نے جلدی سے پوچھا۔ "کیوں واپس آگئے؟"

''بس یونہی چلا آیا۔'' راحت نے مختصر سا جواب دیا۔

''کوئی اِنتظام ہوا؟''

''اِتنی بڑی ڈیمانڈ کا اِنتظام کیسے ہو سکتا ہے؟'' راحت نے دھیرے سے جواب دیا۔

''تو پھر کیا ہوگا؟'' صائمہ بے حد متفکر تھی۔

''دیکھا جائے گا۔'' راحت اور کہہ بھی کیا سکتے تھے۔

''کھانا کھائیے گا؟'' صائمہ نے پوچھا۔

''بھوک نہیں ہے۔''

''اب کھا بھی لیجئے۔'' صائمہ نے زور دے کر کہا۔

''اب بھوک نہیں ہے، کیسے کھاؤں؟ تم کھالو۔''

صائمہ خاموش ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ جب تک یہ معاملہ صاف نہیں ہوگا، راحت کھانا نہیں کھا سکیں گے۔ اب تک جتنی بار بھی اُن لوگوں نے ان کے گھر میں قیام کیا تھا، راحت نے اُن کے جانے کے بعد ہی کھانا کھایا تھا۔ بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی صائمہ چند لقمے زہر مار کر لیتی تھی مگر راحت صرف چائے اور سگریٹ پر ہی گزارہ کرتے تھے۔

وہ دِن گزشتہ رات کی طرح خاصا لمبا ہوگیا تھا۔ جوں جوں پانچ بجے کا وقت قریب آرہا تھا، دِل کی دھڑکنیں تیز ہورہی تھیں۔ دونوں کی نظریں گھر کے باہر اور آس پاس لگی ہوئی تھیں۔ بھادوں اِختتام پذیر ہورہا تھا۔ مکئی کی فصل بڑے زوروں پر تھی۔ گھر آس پاس کی مکئی کی فصل میں گِھرا ہوا تھا۔ جانے کب کوئی کس طرف سے آنکلے گا، کچھ پتہ نہ تھا۔ پانچ بجنے کا اذیت سے اِنتظار کیا گیا۔ ڈیمانڈ پوری نہ ہونے پر جانے آج اُن کے گھر میں کون سا حشر برپا کیا جائے گا، اِس لئے احتیاط کے طور پر پہلے سے ہی چھوٹے دونوں بچوں کو پڑوس میں اُن کے چچا اور دادا دادی کے پاس بھیج دیا گیا تھا اور

جب پانچ بجنے ہی لگے تو گھر کے صحن اور برآمدے میں ٹکنے کی کسی میں ہمت نہ رہی تھی۔ دونوں گھر کے اندر دُبک کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک بیٹھے رہے۔ کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ پھر دروازے میں آ کر دم سادھے کھڑے ہو گئے۔ پانچ بج کر گزر بھی گئے اور کوئی نہ آیا۔ پھر چھ بھی بج گئے مگر کوئی نہ آیا۔ دِل میں موہوم سی خوش فہمیاں جگہ لینے لگیں۔

''شاید اُن کا معاملہ حل ہو گیا ہو!''

تب صائمہ نے کہا۔ ''ہم بھی کتنے نادان ہیں۔ اُن لوگوں نے جو وقت دیا ہے، ٹھیک اُسی وقت پر تو نہیں آئیں گے۔ احتیاط کو تو لازم رکھیں گے ہی۔ بڑی پھوپھی سُنا رہی تھیں کہ کھانے میں احتیاط برتتے ہیں۔ ایک جو کھانا کھاتا ہے، دُوسرا اُس سے الگ قسم کا کھانا کھاتا ہے۔ خیال رکھتے ہیں کہ کھانے میں کوئی غلط چیز شامل نہیں کر دی گئی ہو۔ اب ہمیں بے فکر ہو جانا چاہیے۔ اُن کے آنے کا وقت مقرر نہیں ہوگا۔ بتائے ہوئے وقت پر وہ کبھی نہیں آئیں گے۔''

اِنتظار اِنتظار میں شام ہو گئی اور پھر رات بھی۔ صائمہ نے زبردستی راحت کو کھانا کھلایا۔ گزشتہ رات کی طرح یہ رات بھی خوفناک انداز میں سرکنے لگی۔

''جانے کب دستک سُنائی دے اور پھر کیا سے کیا ہو جائے!''

رات کے گیارہ بجے اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ظاہر تھا کہ یہ کسی اور کا فون نہیں ہو سکتا۔

''آپ اُٹھاؤ۔'' صائمہ نے راحت سے کہا۔

''نہیں، تم ہی اُٹھاؤ۔''

''ہنھ! میں کیسے اُٹھاؤں؟ جانے میرے منہ سے کیسی بات نِکل جائے۔ آپ خود اُٹھاؤ۔'' صائمہ نے اصرار کیا۔

راحت نے فون اُٹھایا۔ بڑی احتیاط سے، اِس خیال سے کہ کسی کو ٹھیس تک نہ پہنچے۔ فون پر راحت نہ، نہ کرتے رہے۔ اپنی مجبوری اور بے بسی کا اِظہار کرتے رہے۔

فون بند ہونے پر صائمہ نے بے تابی سے پوچھا ''کیا کہہ رہا تھا؟''

''کہہ رہا تھا کہ ہم ایک کے بدلے دو دیں گے۔'' راحت کے چہرے پر ایک طنزیہ سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

''دیکھا! کتنا بڑا لالچ دے رہے ہیں۔ یہ ایسے ہی سبھی لوگوں کو پھنساتے ہیں اور آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے تو ہر طرح سے اِنکار ہی کیا ہے۔ مگر وہ مان نہیں رہا ہے۔''

''تو پھر؟'' صائمہ نے بے حد پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ اُس نے پھر فون کرنے کو کہا ہے۔''

دُوسرے روز شام کے پانچ بجے جو فون کی گھنٹی بجی تو صائمہ کا دِل دھڑک اُٹھا۔ راحت اُس وقت گھر میں نہیں تھے۔ صائمہ کو فون سے خوف آنے لگا تھا۔ آخر اُس نے فون اُٹھایا اور مری سی آواز میں کہا ''ہیلو۔'' دُوسری طرف سے راہب کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو مما! میں راہب ہوں۔ آپ پریشان کیوں ہیں؟''

''نہیں تو' میں پریشان نہیں ہوں۔'' اب کے صائمہ ہشاش بشاش ہو کر بولی۔

''مجھے لگا کہ آپ پریشان ہیں۔ گھر میں کوئی آیا گیا تو نہیں؟'' راہب نے فکرمندی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں! بالکل خیریت ہے۔ تم فکر نہیں کرنا۔'' صائمہ کے دِل میں آیا کہ وہ اُسے نئے واقعہ کی اِطلاع دے ڈالے مگر یہ سوچ کر کہ وہ ابھی بچہ ہے اور حساس بھی ہے' پریشان ہو جائے گا۔ اِس لئے اُس نے اُسے بے خبر ہی رکھا۔

کچھ دیر بعد راحت گھر پہنچے تو صائمہ نے فوراً بتایا۔ ''راہب کا فون آیا تھا۔ میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اُٹھایا کہ کہیں وہی نہ ہو۔''

ابھی راہب کی باتیں ہو رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجی۔ راحت نے فون

اُٹھایا۔ صائمہ دم سادھے پاس کھڑی ہوئی۔ راحت کے چہرے پر چھائی دہشت اور بات چیت سے ظاہر تھا کہ فون وصی کا ہی ہے۔ راحت ابھی بات جاری ہی رکھے ہوئے تھے کہ فون بند ہو گیا اور اُن کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' صائمہ نے پوچھا۔

''بہت بگڑ رہا ہے کہ اب تک اِنتظام کیوں نہیں کیا؟ یہ ظالم ایسے جان تو نہیں چھوڑیں گے۔ اب کچھ نہ کچھ اِنتظام کرنا ہی پڑے گا۔'' راحت نے لاچار ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اچھا کیا' جو اِنکار ہی کرتے رہے۔ ایک بار اُن کے کام آ گئے تو پھر یہ جان نہیں چھوڑیں گے۔''

''اور اگر کسی دِن آ کر مار ہی ڈالیں تو؟ یہ جو آئے دِن علاقے میں ہلاکتیں ہوتی ہیں' کیا یہ سبھی مخبری کرنے والے ہوتے ہیں۔ عورتیں اور بچے بھی۔ یہ بس اِسی طرح کی چھوٹی موٹی ناراضگیاں ہوتی ہیں اور جن کے پاس ہتھیار ہوتے ہیں' وہ موت بانٹنے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔'' راحت نے غصّے سے کہا۔

دونوں ہی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ آنے والے خطرناک وقت کا اِنتظار کرنے لگے۔ طرح طرح کے وسوسوں میں گھرنے لگے۔ اگلے پانچ دِنوں تک لگاتار خاموشی چھائی رہی۔ نہ ہی اُن کا کوئی فون آیا اور نہ ہی پانچ بجے آنے والا کوئی آیا۔

صائمہ اور راحت نے سُکھ کی سانس لی کہ معاملہ ٹل ہی گیا ہے۔ شاید اُن کے اپنے ہی پیسے پہنچ گئے ہیں اور اب ضرورت نہیں رہی ہے۔ ساتھ ہی ایک کھٹکا اور اندیشہ سا بھی تھا۔

''ممکن ہے ہمارے اِنکار کرنے پر وہ ہم سے ناراض ہو گئے ہوں اور نہ جانے کب اور کس بہانے آ کر مار ہی ڈالیں۔'' غرض کسی پل اور کسی کروٹ چین نہیں تھا۔

چھٹے دِن رات دس بجے فون کی گھنٹی بجنے پر صائمہ نے فون اُٹھایا۔ دُوسری

طرف سے آواز آئی ''راحت کہاں ہیں؟''

''وہ سوئے ہیں۔آپ کون ہیں؟'' صائمہ نے اجنبی بننے کی کوشش کی۔

''میں وصی ہوں۔آپ نے ہمارا کام کر دیا ہوگا۔کل پانچ بجے میرے آدمی پہنچ جائیں گے۔'' دہشت سے صائمہ کانپ اُٹھی۔اُس کی سانسیں تیز ہوگئیں۔اُس نے نہایت دُکھی بلکہ رونے کے سے انداز میں دُہائی دی ''آپ کیوں ہمیں پریشان کر رہے ہیں؟ آپ یقین تو کریں، اِس وقت ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔جتنی تنخواہ آتی ہے، سب کی سب بینک کا قرض چکانے اور بچوں کی پڑھائی اور ٹیوشن پر خرچ ہوجاتی ہے۔''

''ہم یہاں کے لوگوں پر یقین کر ہی نہیں سکتے ہیں لیکن آپ کو ہم پر یقین کرنا ہوگا کہ ہم آپ سے صرف اُدھار ہی مانگ رہے ہیں، اُدھار، لیکن آپ ہم پر یقین نہیں کر رہے ہیں۔'' وصی کا لہجہ ناراضگی بھرا تھا۔

''نہیں نہیں! ہمیں پورا یقین ہے آپ پر مگر بات صرف اِتنی ہے کہ اِس وقت ہمارے پاس کچھ ہے نہیں۔'' صائمہ نے زور دے کر کہا۔

''آپ تو یہاں کے رہنے والے ہیں۔آپ کہیں سے بھی اِنتظام کر سکتے ہیں۔بس ایک مہینے کی ہی تو بات ہے۔ہم آپ کو ایک مہینے بعد دُگنے دیں گے۔'' وصی نے بڑے مخلص انداز میں کہا۔

''نہیں نہیں! ہم کیوں آپ سے دُگنے لیں گے۔ہم تو ایک پیسہ تک نہیں لیں گے آپ سے۔بس مشکل یہ ہے کہ اِس وقت کسی اور سے لینے کا ہمارے پاس جواز نہیں ہے اور اپنے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور حالات تو یہ ہیں کہ اگر کوئی دُکان سے سامان زیادہ خریدتا ہے تو بھی پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے کہ اِتنا سامان کیوں اور کس لئے خریدا جا رہا ہے۔یہاں تک کہ گھر میں پکا کھانا چیک کیا جاتا ہے کہ گھر میں آدمی کتنے ہیں اور کھانا کتنا پکایا گیا ہے۔اِتنا بڑا اُدھار تو مانگتے ہی آدمی پکڑا جاتا ہے۔آپ

بے شک آ کر ہماری پاس بُکس دیکھ لیجیے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔" وصی کی خاموشی دیکھ کر صائمہ نے بہت سی باتیں کر ڈالی تھیں۔

"ہنھ! ہم کیوں آپ کی پاس بُکس دیکھنے لگے؟ میں پھر فون کروں گا۔" اُس نے ناراضگی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

فون کی گھنٹی سُنتے ہی راحت جاگ گئے تھے اور اِسی بیچ چپکے سے آ کر فون کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے پوچھا "اب کیا کہہ رہا ہے؟" صائمہ نے کہا "بہت ناراض ہو رہا ہے۔ پھر فون کرنے کے لئے کہا ہے اُس نے' اور سُنو میں نے پیسوں والی پاس بُک چھپا رکھی ہے اور دُوسری جن میں تھوڑے پیسے ہیں' وہ سامنے رکھی ہیں کہ کہیں خود آ پہنچا تو دِکھاؤں گی۔ مگر وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے کیا پڑی ہے آپ کی پاس بُکس دیکھنے کی۔"

اگلے روز پھر پانچ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ راحت نے کچھ دیر سُنا اور پھر صائمہ سے کہا "اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ وہ دھمکی دے رہا ہے۔ تم پاس بُکس نِکالو۔ صبح ہی جا کر بینک سے پیسے نِکلوانے ہیں۔ اُنہوں نے واپس کیے تو بھی' نہیں کیے تو بھی۔ اب دینے ہی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ زِندگی بچ جائے۔ کل ہر حال میں بینک والا کام ہونا چاہیے۔ وصی نے چھ بجے شام کا وقت دیا ہے۔"

صائمہ گُم سُم ہو گئی۔ وہ کیا کہتی اور کس سے کہتی۔ بس یہ کہ شوہر کی بیس سال کی ملازمت کے سہارے چھوٹی چھوٹی بچتیں کر کے ایک لاکھ روپے جمع ہوئے تھے۔ بڑا سہارا تھا اِن لاکھ روپوں کا۔ تینوں بچے جوان ہو رہے تھے۔ اُن کی پڑھائی' نوکریوں اور شادیوں کے معاملات سامنے تھے مگر اب کہاں کی مصیبت گلے آن پڑی تھی۔ وہ بھی بغیر کسی بھول چوک کے۔

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر صائمہ پلنگ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

"میں چلی امّاں' بابا کو سب کچھ بتانے۔"

راحت نے روکتے ہوئے کہا'' یہ بے وقوفی مت کرنا۔ وہ پہلے سے ہی خوفزدہ اور پریشان رہتے ہیں۔ اُن سے بات کی تو بات باہر بھی نکل جائے گی بلکہ دُور تک جائے گی۔ جانتی بھی ہو کہ پوٹا لاگو ہو چکا ہے۔ اُن لوگوں کو کھانا کھلانے والا، ساتھ چلنے والا اور مالی یا کسی بھی طرح کی مدد کرنے والا بھی اُتنا ہی مجرم قرار پائے گا جتنے کہ وہ خود۔ مجھے اگر جیل تک پہنچانا چاہتی ہو تو جاؤ، سب کو خبر کر دو۔''

صائمہ کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ اُس رات کھانا نہیں کے برابر کھایا گیا۔ نیند تو رات بھر نہیں آئی۔ ایک خالی پن کا احساس شدت سے ستاتا رہا۔ صائمہ خود کو کوستی رہی کہ کاش! اُس رات فون نہیں اُٹھایا ہوتا۔ ممکن ہے ہم مصیبت سے بچ جاتے۔

صبح ہوئی تو راحت ڈیوٹی پر جانے کے بجائے اپنے بینک بیلنس کی کاپیاں لے کر تھکے ماندے قدموں سے شہر چل دیئے۔ حالانکہ ایک میٹنگ کے سلسلے میں اُن کا ڈیوٹی پر جانا بے حد ضروری تھا۔ گھر سے نکلتے وقت صائمہ نے کہا'' کیوں نہ آدھے پیسے نکلوائے جائیں اور اُن لوگوں کو کہیں کہ ہم سے بس اِتنے ہی بن پائے ہیں۔''

راحت نے چڑ کر کہا'' ٹھیک ہے۔ ہم ایک پیسہ بھی نہیں نکلواتے ہیں۔ اُن لوگوں کو صاف صاف کہہ دیں گے کہ بھئی تمہیں دینے کے لئے ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ مگر اِس کا نتیجہ کیا ہوگا، اُسے بھی مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ کوئی وقت ایسا نہ آجائے کہ تمہیں کہنا پڑے، دو لاکھ لے لو اور ہماری جان بخش دو، آئے دِن جو حادثات اور واقعات رُونما ہو رہے ہیں، اُن سے تم بھی تو باخبر ہو۔ پورے پورے گھر اُجڑ رہے ہیں۔ لوگ گھروں کے اندر زِندہ جلائے جا رہے ہیں۔ پھر بھی تُم .... پیسے تو مجھے بھی پیارے ہیں مگر جان سے زیادہ نہیں۔''

صائمہ کو کوئی جواب نہیں بن پایا۔ اُس نے بس اِتنا ہی کہا'' اچھا جاؤ۔''

راحت جب گھر لوٹے تو اُن کے چہرے کا رنگ اُترا ہوا تھا۔ صائمہ کو فکر ہونے لگی کہ شائد پیسے مل نہیں پائے ہیں اور آج رات کے بعد ہماری صبح نہیں ہوگی مگر

جلد ہی راحت نے کہا ''شکر ہے کہ آج بینک میں چھٹی نہیں تھی اور کیش بھی موجود تھا۔''

اُنہوں نے پیسے نکالے۔ دونوں نے مِل کر پھر سے گِنے۔ راحت نے کہا۔

''اب اِنہیں کہاں پر چھپایا جائے۔''

دونوں کو یوں لگ رہا تھا جیسے اُن کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ بغیر چوٹ لگے کمر یوں بھی ٹوٹتی ہے' اِس کا اُنہیں پہلی بار احساس ہوا تھا۔

پیسوں کو پُرانے کپڑوں کی گٹھڑی میں چھپا دیا گیا اور چھ بجے کا اِنتظار ہونے لگا کہ یہ بوجھ اُن کے سر سے جلد سے جلد اُتر جائے اور اُنہیں اُن کی جان بخشی کا پروانہ مل جائے۔

چھ بجے' سات بھی بجے مگر کوئی نہ آیا۔ راحت سوچنے لگے۔

''اب رات کو آ کر دستک دیں گے تو بڑی دہشت ہوگی۔ اگر رات سے پہلے آ جاتے تو اچھا تھا۔''

مگر رات بھی آہٹیں سُنتے سُنتے گزر گئی۔ دُوسرا دِن اور پھر تیسرا دِن بھی۔ پھر دِن رات گزرتے ہی گئے۔ ہر طرح کی فکریں اور اندیشے ساتھ تھے۔ تلاشی اور چیکنگ کے دوران اگر گھر سے ایک لاکھ روپے برآمد ہوئے تو بھی خیر نہیں تھی۔ ایک روز صائمہ نے کہا ''آئے دِن چوری کی وارداتوں کی خبریں سُننے کو ملتی ہیں اور ہمارے گھر میں ایک لاکھ روپے پڑے ہیں۔ کوئی اور ہی آ کر ہمیں لوٹ لے تو پھر؟ کیا وصی یا اُس کی تنظیم کے لوگ ہماری بات پر یقین کریں گے؟ ہر گز نہیں۔ وہ ہمیں اُلٹا جھوٹ بولنے کے اِلزام میں دھر لیں گے۔''

راحت نے کہا ''اب اُن لوگوں کا اتہ پتہ اور ٹھکانہ بھی تو نہیں ہے نا۔ کوئی کرے تو کرے بھی کیا؟ بلا وجہ اُن لوگوں نے ہمیں مصیبت میں ڈال دیا ہے۔''

پریشانی میں گھرے ہوئے راحت اب صائمہ سے اُلجھنے لگے۔

''میں نہ کہتا تھا کہ یہ گاؤں اور گھر چھوڑ کر شہر میں کوئی کمرہ کرائے پر لے کر رہتے

ہیں۔ وہاں یہ روز روز کی ٹینشن تو نہیں ہوتی۔ پانچ برس پہلے ہی میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اب یہاں پر خیر نہیں۔ جو لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر چلے گئے ہیں' کیا وہ بے وقوف تھے؟ مگر تمہیں یہ گھر بہت پیارا تھا اور تم کہتی تھیں کہ شہر میں خرچ بڑھ جائے گا۔ کرایہ دینا پڑے گا اور سب کچھ خرید کر کھانا پڑے گا۔ لو' اب تو ہوئی نا بچت اور اب تو کہیں آنے جانے کے بھی نہیں رہے ہیں۔''

صائمہ نے سر جھکا دیا۔ وہ دِل ہی دِل میں سوچنے اور راحت کی باتوں کا جواب دینے لگی۔ ''اب تو شہروں میں بھی آئے دِن بم دھماکے ہوتے ہیں۔ خیر' مرنے والے آناً فاناً مرتے ہیں۔ یہاں ہماری طرح ہر رات ذرا ذرا نہیں مرتے۔''

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد صائمہ بولی ''ہم نے کسی دُوسرے کو اب تک کچھ بتایا بھی تو نہیں۔ آپ نے امّاں بابا کو بھی نہیں بتانے دیا۔''

''یہ باتیں کسی کو بتلانے کی نہیں ہوتی ہیں۔ اماں' بابا پریشان ہونے کے سِوا اور کیا کر سکتے ہیں؟ یہ بات صرف اپنے تک رہنی چاہیے' نہیں تو ہمارے لئے دوطرفہ خطرہ ہوگا۔ ساری عمر جیل میں سڑتے رہیں گے ہم۔'' راحت نے زور دے کر کہا۔

اِسی بیچ ساتھ والے گاؤں میں رات بھر فائرنگ ہوتی رہی۔ دُوسرے روز معلوم ہوا کہ دو لوگ مارے گئے ہیں۔ دِل میں ایک آس بندھی کہ ہمارے لاکھ روپے اب بچ ہی جائیں گے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ مرنے والوں میں وصی نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔

ڈر' خطرے' اِنتظار' بے چینی اور فکر مندی کی حالت میں پورے پندرہ دِن گزر گئے۔ گھر میں پڑے لاکھ روپے کے بوجھ تلے صائمہ اور راحت دبے جا رہے تھے۔ کس عجلت میں راحت کو بینکوں میں دوڑ دھوپ کرنا پڑی تھی اور اب اِتنے دِنوں سے کچھ اتہ پتہ ہی نہیں تھا۔ چوری چکاری اور تلاشی کا خطرہ ضرور تھا ورنہ ایک لاکھ روپے تو اپنے پاس ہی تھے۔ ممکن ہے کہ اُن کی ضرورت پوری ہوگئی ہو اور وہ اب نہیں آئیں۔

جلد ہی راحت نے کہا ''شکر ہے کہ آج بینک میں چھٹی نہیں تھی اور کیش بھی موجود تھا۔''

اُنہوں نے پیسے نکالے۔ دونوں نے مِل کر پھر سے گِنے۔ راحت نے کہا۔

''اب اِنہیں کہاں پر چھپایا جائے۔''

دونوں کو یوں لگ رہا تھا جیسے اُن کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ بغیر چوٹ لگے کمر یوں بھی ٹوٹتی ہے' اِس کا اُنہیں پہلی بار احساس ہوا تھا۔

پیسوں کو پُرانے کپڑوں کی گٹھڑی میں چھپا دیا گیا اور چھ بجے کا اِنتظار ہونے لگا کہ یہ بوجھ اُن کے سر سے جلد سے جلد اُتر جائے اور اُنہیں اُن کی جان بخشی کا پروانہ مل جائے۔

چھ بجے' سات بھی بجے مگر کوئی نہ آیا۔ راحت سوچنے لگے۔

''اب رات کو آ کر دستک دیں گے تو بڑی دہشت ہوگی۔ اگر رات سے پہلے آجاتے تو اچھا تھا۔''

مگر رات بھی آہٹیں سُنتے سُنتے گزر گئی۔ دُوسرا دِن اور پھر تیسرا دِن بھی۔ پھر دِن رات گزرتے ہی گئے۔ ہر طرح کی فکریں اور اندیشے ساتھ تھے۔ تلاشی اور چیکنگ کے دوران اگر گھر سے ایک لاکھ روپے برآمد ہوئے تو بھی خیر نہیں تھی۔ ایک روز صائمہ نے کہا ''آئے دِن چوری کی وارداتوں کی خبریں سُننے کو ملتی ہیں اور ہمارے گھر میں ایک لاکھ روپے پڑے ہیں۔ کوئی اور ہی آ کر ہمیں لوٹ لے تو پھر؟ کیا وصی یا اُس کی تنظیم کے لوگ ہماری بات پر یقین کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ وہ ہمیں اُلٹا جھوٹ بولنے کے اِلزام میں دھر لیں گے۔''

راحت نے کہا ''اب اُن لوگوں کا اتہ پتہ اور ٹھکانہ بھی تو نہیں ہے نا۔ کوئی کرے تو کرے بھی کیا؟ بلا وجہ اُن لوگوں نے ہمیں مصیبت میں ڈال دیا ہے۔''

پریشانی میں گھِرے ہوئے راحت اب صائمہ سے اُلجھنے لگے۔

''میں نہ کہتا تھا کہ یہ گاؤں اور گھر چھوڑ کر شہر میں کوئی کمرہ کرائے پر لے کر رہتے

ہیں۔ وہاں یہ روز روز کی ٹینشن تو نہیں ہوتی۔ پانچ برس پہلے ہی میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اب یہاں پر خیر نہیں۔ جو لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر چلے گئے ہیں' کیا وہ بے وقوف تھے؟ مگر تمہیں یہ گھر بہت پیارا تھا نا اور تم کہتی تھیں کہ شہر میں خرچ بڑھ جائے گا۔ کرایہ دینا پڑے گا اور سب کچھ خرید کر کھانا پڑے گا۔ لو' اب تو ہوئی نا بچت اور اب تو کہیں آنے جانے کے بھی نہیں رہے ہیں۔''

صائمہ نے سر جھکا دیا۔ وہ دِل ہی دِل میں سوچنے اور راحت کی باتوں کا جواب دینے لگی۔ ''اب تو شہروں میں بھی آئے دِن بم دھماکے ہوتے ہیں۔ خیر' مرنے والے آناً فاناً مرتے ہیں۔ یہاں ہماری طرح ہر رات ذرا ذرا نہیں مرتے۔''

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد صائمہ بولی ''ہم نے کسی دُوسرے کو اب تک کچھ بتایا بھی تو نہیں۔ آپ نے امّاں بابا کو بھی نہیں بتانے دیا۔''

''یہ باتیں کسی کو بتلانے کی نہیں ہوتی ہیں۔ اماں' بابا پریشان ہونے کے سِوا اور کیا کر سکتے ہیں؟ یہ بات صرف اپنے تک رہنی چاہیے' نہیں تو ہمارے لئے دوطرفہ خطرہ ہوگا۔ ساری عمر جیل میں سڑتے رہیں گے ہم۔'' راحت نے زور دے کر کہا۔

اِسی بیچ ساتھ والے گاؤں میں رات بھر فائرنگ ہوتی رہی۔ دُوسرے روز معلوم ہوا کہ دو لوگ مارے گئے ہیں۔ دِل میں ایک آس بندھی کہ ہمارے لاکھ روپے اب بچ ہی جائیں گے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ مرنے والوں میں وصی نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔

ڈر' خطرے' اِنتظار' بے چینی اور فکرمندی کی حالت میں پورے پندرہ دِن گزر گئے۔ گھر میں پڑے لاکھ روپے کے بوجھ تلے صائمہ اور راحت دبے جا رہے تھے۔ کس عجلت میں راحت کو بینکوں میں دوڑ دھوپ کرنا پڑی تھی اور اب اِتنے دِنوں سے کچھ اتہ پتہ ہی نہیں تھا۔ چوری چکاری اور تلاشی کا خطرہ ضرور تھا ورنہ ایک لاکھ روپے تو اپنے پاس ہی تھے۔ ممکن ہے کہ اُن کی ضرورت پوری ہوگئی ہو اور وہ اب نہیں آئیں۔

مگر سولہویں روز دِن کے بارہ بجے جو فون آیا' اُس سے اُن کی خوش فہمیاں جاتی رہیں۔
فون صائمہ نے اُٹھایا' وصی کا تھا۔ معمول کی طرح سلام کے بعد اُس نے پوچھا۔

''ہمارا کام ہوا؟''

''ہاں۔'' صائمہ نے کہا۔

''پورے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''پورے ہیں۔'' صائمہ نے جواباً کہا۔

آج صائمہ کے لب و لہجہ میں ملتجیانہ انداز ہرگز نہیں تھا بلکہ کچھ حد تک وہ کھرے اور نپے تُلے انداز میں بات کر رہی تھی۔ شاید اِس لئے کہ اُسے یہ زعم تھا کہ وہ اُن کو لاکھ روپے دے رہی ہے یا پھر اِس بات کا غم تھا کہ اُس سے لاکھ روپے لئے جا رہے ہیں۔

''راحت سے کہیے کہ وہ پیسے لے کر اُوپر سڑک پر پہنچ جائیں۔''

''نہیں، نہیں! ہمیں ڈر لگتا ہے اور وہ اِس وقت گھر میں بھی نہیں ہیں۔'' صائمہ نے کہا۔

''میں آدمی بھیج رہا ہوں۔'' وصی نے اِطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''آپ خود آیئے۔'' صائمہ نے کہا۔

''نہیں! میں خود نہیں آ سکتا۔'' اُس کا انداز حتمی تھا۔

''اچھا تو پھر کسی سِول آدمی کو بھی نہیں بھیجنا۔ کل کو بات باہر نکل سکتی ہے اور ہمیں ڈر لگتا ہے۔'' صائمہ نے ذرا ہمت دِکھاتے ہوئے کہا۔

''تو میرے پاس فوجیں ہیں جو میں اُنہیں بھیجوں؟'' وہ کڑک کر بولا۔ اُس کا لہجہ ایک دم خطرناک ہو گیا تھا۔ ''آپ کو ڈر لگتا ہے تو جسے میں بھیج رہا ہوں' کیا اُسے ڈر نہیں لگتا؟ میں تو یہاں ہی ہوں نا؟'' غصّے سے کہی اِن باتوں کے ساتھ ہی زوردار کھڑک سے رِسیور رکھنے کی آواز سُنائی دی۔

وہ ایک لاکھ روپے لے کر بھی ایسا رُخ اپنائے گا' صائمہ کو یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا۔ اُسے تو خوش اور احسان مند ہونا چاہیے تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت اِن سے ایک لاکھ روپے لے رہا ہے مگر وہ اِتنی سی بات پر اِس قدر آگ بگولہ ہو گیا۔

صائمہ کچھ دیر کے لئے سٹپٹا سی گئی۔ اُس کے سخت گیر رویئے پر دم بخود سی رہ گئی۔ پھر دِل ہی دِل میں کھولنے لگی۔

''ہُنھ! تمہارے پاس فوجیں نہیں ہیں تو کیا تم مجھ پر احسان کرنے جا رہے ہو۔ ارے! تم ہم سے ایک لاکھ روپے لے رہے ہو' ایک لاکھ۔''

''میں جسے بھیج رہا ہوں' کیا اُسے ڈر نہیں لگتا ہے؟ میں تو یہاں ہی ہوں نا؟''

''ہنھ! ارے تمہارے ڈر سے وہ کسی کو بتلائے گا نہیں مگر جب کبھی پولیس اور آرمی کے ہتھے چڑھ گیا اور اِنٹیروگیشن جا پہنچا تو کیا وہاں بھی وہ تمہارے ڈر سے کچھ نہیں بتلائے گا........؟ کیا وہاں بھی تم اُس کی زبان بند رکھ سکو گے........؟ ''میں جو یہاں ہوں نا۔ ہنھ! ارے! تم لوگوں کے ہونے کی گارنٹی ہی کیا ہے۔ کب تک چھپتے چھپاتے رہو گے؟''

صائمہ کی زبان پر بس یہی کلمات تھے۔ وہ اُس کی کہی ہوئی باتوں کی بار بار نقل اُتارتی اور خود ہی جواب دیتی جاتی۔ وہ اندر باہر چلتے پھرتے' کام کرتے ہوئے دِل ہی دِل میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

''ایک تو یہ کہ دھمکیاں دے کر ہم سے اِتنی بڑی رقم لے رہا ہے' اُوپر سے کس قدر بگڑ رہا ہے۔ رسیور کس زور سے پٹخا ہے اُس نے۔ ارے سچ کہتے ہیں لوگ کہ تم کسی کے ہمدرد نہیں ہو سکتے ہو۔ بھلا جن کے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوں وہ کس کے ہمدرد اور احسان مند ہو سکتے ہیں!''

صائمہ لگاتار تین گھنٹوں سے کھولے جا رہی تھی۔ دِن کے قریب تین بجے راحت گھر لوٹے۔ اُس وقت گھر میں پڑوس کی ایک عورت پہلے سے ہی موجود تھی۔

مگر سولہویں روز دِن کے بارہ بجے جو فون آیا' اُس سے اُن کی خوش فہمیاں جاتی رہیں۔

فون صائمہ نے اُٹھایا' وصی کا تھا۔ معمول کی طرح سلام کے بعد اُس نے پوچھا۔

''ہمارا کام ہوا؟''

''ہاں۔'' صائمہ نے کہا۔

''پورے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''پورے ہیں۔'' صائمہ نے جواباً کہا۔

آج صائمہ کے لب و لہجہ میں ملتجانہ انداز ہرگز نہیں تھا بلکہ کچھ حد تک وہ کھرے اور نپے تُلے انداز میں بات کر رہی تھی۔ شاید اِس لئے کہ اُسے یہ زعم تھا کہ وہ اُن کو لاکھ روپے دے رہی ہے یا پھر اِس بات کا غم تھا کہ اُس سے لاکھ روپے لئے جا رہے ہیں۔

''راحت سے کہیے کہ وہ پیسے لے کر اُوپر سڑک پر پہنچ جائیں۔''

''نہیں، نہیں! ہمیں ڈر لگتا ہے اور وہ اِس وقت گھر میں بھی نہیں ہیں۔'' صائمہ نے کہا۔

''میں آدمی بھیج رہا ہوں۔'' وصی نے اِطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''آپ خود آئیے۔'' صائمہ نے کہا۔

''نہیں! میں خود نہیں آ سکتا۔'' اُس کا انداز حتمی تھا۔

''اچھا تو پھر کسی سِول آدمی کو بھی نہیں بھیجنا۔ کل کو بات باہر نکل سکتی ہے اور ہمیں ڈر لگتا ہے۔'' صائمہ نے ذرا ہمت دِکھاتے ہوئے کہا۔

''تو میرے پاس فوجیں ہیں جو میں اُنہیں بھیجوں؟'' وہ کڑک کر بولا۔ اُس کا لہجہ ایک دم خطرناک ہو گیا تھا۔ ''آپ کو ڈر لگتا ہے تو جسے میں بھیج رہا ہوں' کیا اُسے ڈر نہیں لگتا؟ میں تو یہاں ہی ہوں نا؟'' غصّے سے کہی اِن باتوں کے ساتھ ہی زوردار کھڑک سے رِسیور رکھنے کی آواز سُنائی دی۔

وہ ایک لاکھ روپے لے کر بھی ایسا رُخ اپنائے گا' صائمہ کو یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا۔ اُسے تو خوش اور احسان مند ہونا چاہیے تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت اِن سے ایک لاکھ روپے لے رہا ہے مگر وہ اِتنی سی بات پر اِس قدر آگ بگولہ ہوگیا۔

صائمہ کچھ دیر کے لئے سٹپٹا سی گئی۔ اُس کے سخت گیر رویئے پر دم بخود سی رہ گئی۔ پھر دل ہی دِل میں کھولنے لگی۔

''ہُنھ! تمہارے پاس فوجیں نہیں ہیں تو کیا تم مجھ پر احسان کرنے جا رہے ہو۔ ارے! تم ہم سے ایک لاکھ روپے لے رہے ہو' ایک لاکھ۔''

''میں جسے بھیج رہا ہوں' کیا اُسے ڈر نہیں لگتا ہے؟ میں تو یہاں ہی ہوں نا؟''

''ہنھ! ارے تمہارے ڈر سے وہ کسی کو بتلائے گا نہیں مگر جب کبھی پولیس اور آرمی کے ہتھے چڑھ گیا اور اِنٹیروگیشن جا پہنچا تو کیا وہاں بھی وہ تمہارے ڈر سے کچھ نہیں بتلائے گا........؟ کیا وہاں بھی تم اُس کی زبان بند رکھ سکو گے........؟'' میں جو یہاں ہوں نا۔ ہنھ! ارے! تم لوگوں کے ہونے کی گارنٹی ہی کیا ہے۔ کب تک چھپتے چھپاتے رہو گے؟''

صائمہ کی زبان پر بس یہی کلمات تھے۔ وہ اُس کی کہی ہوئی باتوں کی بار بار نقل اُتارتی اور خود ہی جواب دیتی جاتی۔ وہ اندر باہر چلتے پھرتے' کام کرتے ہوئے دِل ہی دِل میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

''ایک تو یہ کہ دھمکیاں دے کر ہم سے اِتنی بڑی رقم لے رہا ہے' اُوپر سے کس قدر بگڑ رہا ہے۔ رسیور کس زور سے پٹخا ہے اُس نے۔ ارے سچ کہتے ہیں لوگ کہ تم کسی کے ہمدرد نہیں ہو سکتے ہو۔ بھلا جن کے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوں وہ کس کے ہمدرد اور احسان مند ہو سکتے ہیں!''

صائمہ لگاتار تین گھنٹوں سے کھولے جا رہی تھی۔ دِن کے قریب تین بجے راحت گھر لوٹے۔ اُس وقت گھر میں پڑوس کی ایک عورت پہلے سے ہی موجود تھی۔

چائے پانی پوچھنے کے بعد صائمہ فون پر ہونے والی بات راحت کو سُنانا چاہتی تھی مگر منتظر تھی پڑوسن کے گھر جانے کی اور اُسی وقت ایک اجنبی نوجوان ہشاش بشاش انداز میں اسلام علیکم کہتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اجنبی نے بالکل واقف کاروں کے سے انداز میں حال احوال پوچھا اور پانی مانگا۔ پانی پینے کے فوراً بعد اُس نے راحت سے کہا۔

''بھائی صاحب! آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔'' اور اُٹھ کر خود ہی ساتھ والے کمرے میں چل دیا۔ راحت بھی ساتھ ہو لئے۔ کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ صائمہ بُری طرح گھبرا گئی۔ راحت نے صائمہ کو اندر بُلایا اور کہا۔ ''وہ والے پیسے نکالو۔''

صائمہ نے ڈُوبتے دِل سے پچھواڑے کے کمرے میں جا کر پیسے نکالے اور واپس آ کر راحت کے ہاتھ میں تھما دئے۔ پیسے نکالتے ہوئے صائمہ کے جی میں آیا کہ وہ ایک گڈی بچالے۔ مگر راحت کے اور راحت سے بھی کہیں زیادہ اُن لوگوں کے ڈر اور خوف سے اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے ہاتھوں آپ لُٹ جانے کا اذیت ناک منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

اجنبی نے دس، دس ہزار کی کچھ گڈّیاں اپنی بیلٹ میں اُڑس لیں اور باقی والی ہاتھ میں پکڑے کالے رنگ کے پولی تھین کے لفافے میں، جس میں لگتا تھا کہ پہلے سے کچھ رقم موجود ہے، ڈال کر پیکٹ کی شکل میں پکڑ لیں۔ وہ کسی بھی طرح کے ڈر اور خوف میں مبتلا نہیں تھا۔ جبکہ صائمہ اور راحت کی اندرونی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ نہیں دیتے تو دہشت پسندوں کی طرف سے خطرہ یقینی تھا اور اب دینے کی صورت میں اپنے نقصان کے علاوہ پولیس اور آرمی کی مار پیٹ، پھر انٹیروگیشن، پوٹا اور جیل یقینی تھی۔ راحت نے نہایت اِنکساری کے ساتھ اجنبی سے کہا ''بس اِتنا خیال رکھنا کہ ہمارا نام سامنے نہیں آئے۔'' اجنبی نے جواب میں کہا'' اس بات کا علم صرف مجھے، آپ کو اور وصی کو ہے۔ آپ دُعا کیجئے، میں وصی تک بخیر و عافیت پہنچ جاؤں اور بس۔''

اجنبی جس طرح آیا تھا اُسی طرح ہشاش بشاش، اُچھلتا کودتا ہوا چل دیا۔ وہ

کچھ بڑھی ہوئی گھنی داڑھی، مونچھ والا چھبیس ستائیس سال کا نوجوان تھا۔

علاقے کے حالات یہ تھے کہ لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرتے تھے اور پڑوسن اب بھی گھر میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔ خیریت یہ رہی کہ اُس نے نوجوان کے آنے جانے سے متعلق کوئی جانکاری نہیں مانگی اور کچھ دیر بعد چلی گئی۔ تب صائمہ نے راحت سے پوچھا۔ ''کیا کہا تھا اُس نے آپ کو کمرے میں لے جا کر؟''

''کہہ رہا تھا' مجھے وصی نے بھیجا ہے۔ اُسی کی نشاندہی پر بڑی مشکل سے آپ کا گھر ڈھونڈا ہے۔ ایک لاکھ روپے مانگے ہیں۔''

''اپنے بارے میں کچھ بتایا اُس نے؟'' صائمہ نے مزید پوچھا۔

''اپنا نام گلریز بتا رہا تھا۔ مگر سچ کون کہتا ہے۔ اتہ پتہ اور مزید کچھ میں نے پوچھا ہی نہیں۔ اِس قسم کے لوگوں سے زیادہ جان پہچان کرنی ہی نہیں چاہیئے۔ اُن لوگوں سے ملے ہوئے اور خطرناک لوگ ہوتے ہیں یہ' اور ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ واپس کرتے ہوئے ممکن ہے یہ لوگ کچھ اُوپر دینے کی کوشش کریں مگر ایک پیسہ بھی اُوپر مت لینا۔'' راحت نے زور دے کر کہا۔

صائمہ نے کہا ''ہاں' بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ میں بھی یہی بات آپ کو کہنے والی تھی۔ آدمی لالچ میں آ ہی جاتا ہے۔ مگر ہمیں یہاں بہت چوکس رہنا ہوگا۔ نہیں تو اِن لوگوں سے جان ہی نہیں چھوٹے گی ہماری۔ ہمارے گھر کو اڈہ بنالیں گے۔ ہمارے اپنے ہی واپس دے دیں تو ہمارے لئے لاکھ نعمت ہے۔''

اُمید تھی کہ رات کو فون آئے گا اور وصی پیسے ملنے کی اِطلاع دے گا مگر کوئی فون نہیں آیا اور نہ ہی پیسے ملنے کی کوئی اِطلاع ملی۔ پچھلے دو ہفتوں سے چلا آرہا فون کا معاملہ اب ختم تھا۔ وقت گزرنے لگا اور لاکھ روپے کا غم بڑھنے لگا۔ ساتھ ایک خدشہ بھی تھا۔ خیر ایک ایک دِن کر کے مہینہ پورا ہوا۔ پیسے اب ملے کہ تب۔ اِنتظار ہونے لگا۔ کسی رات وہ لوگ خود آئیں گے مگر بڑی دہشت ہوگی۔ وہ خود کبھی نہ آئیں۔ بس

اِسی طرح دِن دھاڑے کوئی اُچھلتا، کودتا ہوا آئے اور ہمارے ایک لاکھ لوٹا کر چلا جائے۔ مگر کوئی نہیں آیا۔ دو مہینے گزرے۔ چھ مہینے بھی گزرے اور وصی نے پیسے ملنے کی اِطلاع تک نہیں دی تھی۔ اِسی بیچ علاقے میں کئی اور وارداتیں ہوئیں۔ کریک ڈاؤن لگے، کراس فائرنگ ہوئی، کچھ دہشت پسند مارے گئے، کچھ مخبری کرنے والے کاٹے گئے مگر وصی کی زِندگی کے لئے دُعائیں کی جاتی تھیں۔ ایک روز صائمہ نے کہا ''کیا اب بھی میں کسی سے ذِکر نہیں کروں۔'' راحت نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بہت شوق ہے تمہیں دُوسروں کو بتانے کا........ جاؤ، جاؤ سب کو بتادو۔ ممکن ہے کوئی تمہاری مدد کردے۔''

کچھ دِنوں سے علاقے میں وصی کی موجودگی کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وصی ایریا کمانڈر تھا اور دس سالوں سے اُس علاقے میں سرگرم تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اُس کے ساتھیوں میں سے کسی نے اِتنی لمبی عمر نہیں پائی تھی۔ وہ ہر دُوسرے تیسرے ماہ کسی نہ کسی گھر میں ایک رات اور دِن کے لئے موجود ہوتا تھا۔ ہر بار اُس کے ساتھ دو تین نئے چہرے ہوتے تھے۔ علاقے میں ہوئے بم دھماکے اور سول ہلاکتیں، سب وصی سے ہی منسوب کی جاتی تھیں۔

سارے گاؤں میں وصی کی موجودگی سے دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ صائمہ اور راحت کو دہشت کے ساتھ ساتھ ایک اُمید بھی تھی۔ ایک لاکھ روپے لوٹا دینے کی اُمید اور یہ تشویش بھی کہ وصی اگر زِندہ ہے تو اُس نے اب تک ہمارے پیسے کیوں نہیں لوٹائے۔ شاید کہیں دُور پار یا واپس چلا گیا ہوگا مگر کسی کے ہاتھ بھیج تو سکتا تھا نا۔
کبھی کبھی دِل میں ایک خوف سا بھی اُٹھنے لگتا ''اگر وہ واپس لوٹانے پر آمادہ ہی نہ ہو، تو ہم اُس کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں؟''

حالات کے مدِ نظر ہر گاؤں میں ہر بستی کے لوگ چوکس رہا کرتے تھے۔ صبح اُٹھ کر گرد و نواح کے حالات اور ماحول کا جائزہ لینا از حد ضروری تھا۔ اِس کے بعد ہی

لوگ اپنے اپنے کاموں پر جاتے تھے۔

اُس روز صبح جو ہوئی تو اڑوس پڑوس میں سب کچھ معمول سے ہٹ کر تھا۔ کسی گھر کے آنگن میں بچوں کی چہل پہل نہیں تھی ——— کسی گھر کے چولہے سے چائے اور ستو بھننے کی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ گھروں کے پچھواڑے اور دائیں بائیں بندھے مال مویشیوں کا چارہ پانی اور دیکھ ریکھ کرتے اور دودھ دوہتے ہوئے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مال مویشی جیسے چپ چاپ اور دم سادھے کھڑے ہوں۔ شباب پر آئے ہوئے سرسبز اور گنجان پیڑوں پر سے چڑیوں کی چہچہاہٹ غائب تھی۔ کتے رات بھر کی معرکہ آرائی کے بعد گھروں سے غائب تھے یا پھر کہیں کونے کھدرے میں دُبک کر خاموش بیٹھے تھے۔

راحت معمول کی طرح ٹہلتے ہوئے دس پندرہ گز کے فاصلہ پر اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کے گھر چلے گئے۔ اُن کے گھر کے باہر آنگن کا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا اور گھر کے اندر سٹوو پر چائے بنائی جا رہی تھی۔ اماں نے اُنہیں آگاہ کیا۔ ''آج گڑ بڑ ہے اور میری مانو تو دونوں بھائی جلدی سے شہر نکل جاؤ۔''

راحت کا دِل زور سے دھڑکا اور پھر شانت ہو گیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی رحمت نے خوف سے سوکھے ہوئے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں راحت کو بتایا ''امینے کے گھر رات کو دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی تھی۔ کتا بھی وہیں بھونک رہا تھا۔ کسی نے کتے کو مارا بھی تھا۔''

''کچھ معلوم ہے کون کون لوگ ہیں؟'' راحت نے پوچھا۔

''ابھی کچھ معلوم نہیں ہوا ہے۔'' رحمت نے جواب دیا۔ راحت وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد رحمت کی بیوی نلکے سے پانی بھر کر لوٹی تو خوفزدہ حالت میں اِطلاع دی۔ ''وصی ہے وصی۔ اُس کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی ہیں۔ نلکے پر نسیمہ نے بتایا ہے۔ کہتی ہے اِس وقت تینوں بے سدھ پڑے ہیں اور ہم آدھی رات سے جاگ کر

چوکیداری کر رہے ہیں۔"

طریقہ یہ تھا کہ جس جس گھر میں وہ لوگ موجود ہوتے' اُس گھر کے لوگوں کو اُن کی نگرانی پر مامور ہونا ہی پڑتا تھا کہ کہیں اچانک آرمی سر پر نہ آن پہنچے اور فائرنگ کی زد میں وہ خود یا اُن کا گھر تباہ نہ ہو جائے۔ آس پاس کے سبھی لوگ کام کے بہانے شہر نکل جاتے۔ کوئی ایک آدھ ہی گھر میں ٹکتا اور چوکس رہتا۔

راحت واپس اپنے گھر آئے اور صائمہ کو سب کچھ بتلایا۔ صائمہ کا دل بلیوں اُچھلا اور پھر بیٹھ گیا۔ لاکھ روپے اب واپس ملنے ہی والے تھے۔ اُسی وقت صائمہ کی ہتھیلیوں میں زور کی کھجلی ہوئی۔ اُس نے ہتھیلیاں کھجاتے ہوئے راحت کے سامنے پھیلا دیں اور کہا "ہفتے بھر سے میری ہتھیلیوں میں کھجلی ہو رہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا۔ مگر اب کے یہ کھجلی کچھ پانے کی ہے' کھونے کی نہیں ہے۔"

وہ دِن سب کے لئے نہایت فکرمندی کا تھا۔ یوں تو چند دن قبل ہی آرمی گھر گھر کی تلاشی لے چکی تھی مگر مخبری ہونے پر آرمی دوبارہ آسکتی تھی۔ اکثر تو ایسا ہی ہوتا تھا کہ وہ آکر جاتے تھے' تب یہ آتے تھے۔ آمنا سامنا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ پھر بھی لوگوں کو بہت ڈر لگا رہتا تھا۔ دِن بخیر گزرا۔ شام کو اِطلاع ملی کہ وہ لوگ امینے کے گھر سے چلے گئے ہیں۔ مگر اُنہوں نے جانا کہاں تھا؟ سب کو معلوم تھا کہ اگلی صبح وہ کسی دُوسرے گھر میں موجود ہوں گے۔ جب بھی وہ لوگ آتے تھے' ایک ایک رات ہر گھر میں گزار کر جاتے تھے۔ تاکہ اپنے ذاتی اِختلافات کی وجہ سے کوئی دُوسرے پر مخبری کرنے اور الزام دینے کے قابل نہ رہے۔

رات کا آخری پہر تھا۔ دروازے پر زوردار دستک ہوئی' مانو بھونچال آ گیا ہو۔ صائمہ اور راحت ایک طرح سے منتظر بھی تھے۔ دُعائیں بھی کر رہے تھے۔ پھر بھی دل بُری طرح تڑپ اُٹھے۔ صائمہ نے دِل پر ہاتھ رکھ کر خوب دبایا اور خود کو سنبھالا۔

"کون ہے؟" راحت نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔'' جواب ملا۔ اب دروازہ کھولنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ سب سے پہلی بار جب اِس طرح کی دستک ہوئی تھی تو دروازہ نہیں کھولا گیا تھا۔ تب توڑا گیا تھا اور اُس کے بعد جو عبرت ہوئی تھی وہ مارے خفت کے کسی دُوسرے کو بتانے کے قابل نہیں تھی۔

ایک ہی آدمی دروازے کے باہر کھڑا دِکھائی دیا۔ دروازہ کھلنے پر دو آدمی اور اندر آ گئے۔ اُن میں ایک وصی ہی تھا۔ دہشت تو تھی ہی مگر دِل ہی دِل میں وصی کا سواگت بھی ہوا۔ تینوں ایک کمرے میں سو گئے۔ گھر والوں کی نیند کوسوں دُور بھاگ گئی۔ صبح دس بجے کے قریب وہ جاگے اور چائے مانگی۔ دو بجے کھانا کھایا مگر وصی ایک لاکھ روپوں کا ذِکر تک نہیں کر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی اُنہوں نے چلے بھی جانا تھا۔ کسی دُوسرے گھر میں جب وہ موجود ہوں تو دائیں بائیں یا اڑوس پڑوس کا بچہ بھی اُس گھر میں جھانکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بس ڈر ہی لگتا تھا۔ رہ رہ کر راحت نے ذِکر چھیڑا۔

''ہم نے جن لوگوں سے اُدھار لے کر آپ کو دیئے تھے۔ وہ اب ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس اُس وقت اپنا تو کچھ تھا نہیں۔ بس کئی لوگوں سے اُدھار ہی لئے تھے۔ آپ نے تو اُس وقت ایک مہینے کا کہہ کر ہم سے لئے تھے۔ اب تو چھ سات مہینے ہو رہے ہیں۔''

وصی حیرت سے راحت کا منہ تکتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کون سے پیسے؟ کس سے لئے اور کس کو دیئے؟ کوئی خواب دیکھا ہے کیا یا پھر ہم پر اِلزام لگا کر ہمیں گھر میں آنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

وصی نے بڑے رُوکھے اور تیکھے لہجے میں باتیں کی تھیں اور اب راحت کا منہ ہی نہیں آنکھیں بھی حیرت سے کھل گئی تھیں۔ وہ چیخنے کے سے انداز میں بولا ''کیا آپ نے فون پر مانگ کر ہم سے ایک لاکھ روپے نہیں لئے تھے۔ وہ بھی مار ڈالنے کی دھمکیاں دے کر؟''

''بالکل نہیں۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ میں کیوں اور کس لئے آپ سے پیسے لیتا، کھانا مل ہی جاتا ہے اور ہم نے لاکھوں کمانے کے لئے گن نہیں اُٹھائی ہے۔ ہمارا مشن خالص جہاد ہے۔ اگر واقعی آپ سے کسی نے روپے لئے ہیں تو وہ کوئی اور ہوگا۔ یہیں کا کوئی لوکل۔ وہ ہمارے لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔'' وصی نے فیصلہ کُن انداز میں جواب دیا۔

صائمہ دروازے سے لگی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اُس کی حالت غیر ہورہی تھی۔ راحت نے صائمہ کو بھی اندر بُلا لیا۔ دونوں قسمیں کھا کھا کر اور ساری باتیں گن گن کر بتانے لگے کہ کس طرح اُن سے ایک لاکھ روپے لئے گئے۔ اُس وقت وہ آرمی کے سر پر آجانے کا خطرہ تک بھول چکے تھے۔ صائمہ پہلی بار اُن لوگوں کے رُوبرو ہوئی تھی۔ پہلے بھی ایک دوبار یہ لوگ اِسی طرح ایک آدھ دِن کے لئے اُن کے گھر میں رہ چکے تھے مگر صائمہ نے مارے ڈر کے اُن کی صورت تک دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ جس وصی سے سارے علاقے میں دہشت پھیلی ہوئی تھی اور جس وصی کے بارے میں صائمہ طرح طرح کی خوفناک باتیں سنا کرتی تھی، وہ ایک دبلے پتلے، چوبیس پچیس سالہ خوبصورت نوجوان کی صورت میں اُس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ اُس خوبصورت نوجوان کی خاطر کوئی بھی حسین اور نوجوان لڑکی گھر سے بھاگ سکتی تھی۔ زہر تک کھا سکتی تھی مگر وصی جن خطرناک اور قاتل راہوں پہ گامزن تھا، ہر کوئی اُس کے سائے سے بھی دُور رہنا چاہتا تھا۔ وصی نے صائمہ سے پوچھا ''آنٹی! فون آپ نے بھی سنے ہیں، تو کیا وہ آواز میری تھی۔''

''فون پر آواز ذرا بدل بھی تو جاتی ہے اور میں نے پہلے کبھی آپ کی آواز سنی بھی تو نہیں تھی۔'' صائمہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''تو پھر آپ نے کیوں کر یقین کر لیا کہ فون پر پیسے مانگنے والا میں ہی ہوں؟''

''اُس نے گزشتہ سال والا واقعہ یاد دِلایا تھا۔'' صائمہ نے کہا۔

''کون سا؟'' وصی نے چونک کر پوچھا۔

''وہی جب آپ دو اور لوگوں کے ساتھ اِسی طرح یہاں موجود تھے اور آرمی کے آنے کی اِطلاع ملی تھی مگر آپ گھر سے نکلنے کو تیار ہی نہیں ہوئے تھے اور ہمیں گھر کو باہر سے تالا لگوا کر بھاگ جانے کو کہا تھا اور ہم اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے تھے۔''

''اوہ ہاں!'' وصی نے کہا۔ ''مگر ایسے واقعے تو ہمارے ساتھ کئی بار ہوئے ہیں۔ ہم جب مقابلہ کرنے یا بھاگنے کی صورت میں نہیں ہوتے ہیں تو گھر والوں کو بھگا دیتے ہیں' باہر سے تالا لگوا کر۔ کیونکہ آرمی بند مکانوں کے تالے کھلوا کر تلاشی نہیں کرتی ہے۔ ہم گھر کے اندر دُبک کر بیٹھے رہتے ہیں مگر وہ دِن ہمارے لئے بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ ہمیں رات گزارنے کا پتہ ہی نہیں چلتا ہے۔ رات کو ہمیں کئی کام نپٹانے ہوتے ہیں۔''

''تو پھر وہ کون تھا؟'' راحت نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

وصی جو ٹیڑھے سے انداز میں لیٹا تھا' اُٹھ بیٹھا اور راحت سے مخاطب ہوا۔

''آپ میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ پیسے مانگنے اور لینے والا میں ہوں؟ آپ فون کرنے والے کو یہ تو کہتے کہ آ کر خود لے جاؤ۔ جو لینے آیا تھا اُسے واپس بھیج دیتے کہ جاؤ' ہم وصی کو اپنے ہاتھوں دیں گے۔''

اُس کی اِس بات پر صائمہ اور راحت دونوں چونک اُٹھے۔

''ہاں! ہم ایسا کہہ سکتے تھے!'' صائمہ جلدی سے بولی۔

''ہم نے بہت کچھ کہا بھی تھا۔ لاکھ اِنکار کیا تھا' مگر ڈر تو لگتا ہی ہے نا آپ لوگوں کا نام سن کر۔''

''کیوں ڈر لگتا ہے؟'' وصی تلخ لہجے میں بولا۔ ''ہم جلاد ہیں کیا؟ ہم آپ کے دشمن ہیں کیا؟ ہم تو اُن لوگوں کے دشمن ہیں جو مخبری کرتے ہیں۔ ہمیں ملی ٹینٹ کہتے ہیں۔ ہمارے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ ہم سوئے ہوتے ہیں اور آرمی

ہمارے سر پر چڑھ آتی ہے۔ آرمی کو خبر کرنے والے یہیں کے لوگ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو آزادی دِلانے کے لئے ہم لوگ لڑ رہے ہیں، وہی لوگ اگر ہمارے خلاف مخبری کریں تو ہم اُنہیں معاف نہیں کر سکتے۔"

صائمہ اور راحت سوچوں میں گم تھے۔ اُنہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ لاکھ روپے اب اُنہیں ملنے والے نہیں ہیں۔ وصی کی باتوں میں اُنہیں سچائی نظر آ رہی تھی۔ وہ اگر جھوٹ بھی بول رہا تھا تو بھی وہ اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔

"ایک لاکھ روپے ہم سے لئے گئے ہیں آپ کے نام سے۔ فون کرنے والا کون تھا، یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔" راحت نے پریشان لہجے میں کہا۔

"آپ نے جس کے ہاتھ میں تھمائے ہیں اُس کی تاک میں رہیئے۔ اُسے پہچانئے اور پھر مجھے آگاہ کیجئے۔ میں اُس کا سر آپ کے قدموں میں لاکر رکھ دُوں گا۔" وصی نے کہا۔ صائمہ نے وہاں سے اُٹھنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کی۔

"خطرناک لوگ ہو تم۔ ہمارے لاکھ روپے تو گئے لیکن کسی کا سر کٹوانے کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔" صائمہ نے دل میں کہا۔

وصی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ نامعلوم لوگ ہمارے نام سے چوری جیسی وارداتیں انجام دے رہے ہیں۔ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر کچھ نہ کچھ بٹور لیتے ہیں۔ نقلی ہتھیار لے کر لوگوں کے گھروں میں گھستے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنا ایک بیٹا ہمارے حوالے کرو یا پھر ایک لاکھ روپیہ۔ دراصل یہ لوگ ہماری تنظیموں کو بدنام کرنے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔ ہم خود ایسے لوگوں کی تلاش میں ہیں۔"

راحت کو اچانک خیال آیا کہ لاکھ روپے تو گئے اب کہیں آرمی نہ سر پہ آن ٹپکے اور ہم جان سے جاتے رہیں۔ وہ اُٹھے تو ساتھ صائمہ بھی مایوس حالت میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ شام ہوتے ہی وصی اور اُس کے ساتھی گھر سے نکل گئے۔ چلتے ہوئے وصی نے کہا "اب بھی اگر آپ کو مجھ پر شک ہے تو میں دس منٹ بعد کہیں سے آپ کو

فون کروں گا۔ آواز پہچان کر مجھے بتلانا۔"

"اب ہم بہت ٹوٹ چکے ہیں۔ اب کے آپ لوگ اگر ہمارے گھر نہیں آئیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" راحت نے ایک التجا کی۔

"وہ دیکھا جائے گا۔ کہیں نہ کہیں تو گزارہ کرنا ہی پڑتا ہے۔" وصی نے لاپرواہی سے کہا۔

دس منٹ بعد فون آیا۔ راحت نے فون اُٹھایا۔ چند باتیں کیں پھر ریسیور صائمہ کو تھما دیا۔ صائمہ نے وصی سے کہا "ذرا غصے سے کہئے۔ میرے پاس فوجیں ہیں جو میں اُنہیں بھیجوں۔" وصی نے دو تین بار ویسے ہی کہا اور پوچھا' اب بتاؤ آنٹی' کیا میری آواز وہی ہے جو آپ نے پہلے سنی تھی؟"

صائمہ کے دِل میں آیا کہ "ہاں" کہہ دے مگر دِماغ نے رہنمائی کی۔

"وہ ابھی آکے مار دے گا۔ لاکھ روپے کا اِلزام دینے کے بدلے میں۔"

"نہیں بہت فرق ہے۔" صائمہ نے جواباً کہا اور ساتھ ہی فون کاٹ دیا۔

اب گھر میں اُداسیوں' محرومیوں اور غربت نے مستقل ڈیرے ڈال لئے۔ صائمہ اور راحت کبھی ایک دُوسرے سے اُلجھتے اور کبھی ایک دُوسرے کو ڈھارس بندھاتے۔ راحت ڈھارس بندھاتے ہوئے اکثر کہتے "یہی سمجھو کہ ہمارے پاس کچھ تھا ہی نہیں......... یہاں کتنے ہی لوگوں کی زِندگیاں چلی گئیں ہیں.........ہم تو پھر بھی خوش نصیب رہے ورنہ کسی نہ کسی رنگ میں ملی ٹینسی نے سب کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے........"

"اب بھی میں کسی سے اِس بارے میں بات کروں یا راز کو راز ہی رہنے دیا جائے؟" ایک روز صائمہ نے پوچھا۔ راحت ذرا سے ہنس دئے اور کہا "بات کرسکتی ہو تا کہ کوئی اور دھوکہ نہ کھائے مگر انجام کیا ہوگا' اُس کا ذِمہ دار میں نہیں ہوں گا۔"

ooo

دو حکمران

خود کو بیوہ اور بے سہارا بتلا کر اُس نے مدد کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ وہ شکل وصورت سے تو جنت کی حور تھی مگر حالات سے بدحال۔

''کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''کیوں کر اور کب سے بیوہ اور بے سہارا ہو؟'' ایسے سوالوں کے جواب میں اِس کی زبان گنگ اور آنکھیں دُور دُور تک ویران اور خشک تھیں۔

آخر بے حد اصرار کے بعد وہ تھکی تھکی سی آواز میں کچھ یوں گویا ہوئی۔

''میں ہوں رہنے والی اُس سلطنت کی، جس میں اکثریت ہے بیواؤں اور یتیم بچوں کی، جس کے حاکم ہیں دو۔ ایک کی حکومت چلتی ہے دِن کے اُجالے میں اور دُوسرے کی رات کے اندھیرے میں۔ دفاتر، مجلسیں اور عدالتیں لگتی ہیں دِن کو بھی اور رات کو بھی۔ لین دین، کاروبار اور دیگر معاملات طے پاتے ہیں دِن کو بھی اور رات کو بھی۔ مگر اِس سب کے باوجود سلطنت دِن دُگنی اور رات چوگنی اِنتشار کا شکار ہے اور بدحالی کی طرف گامزن ہے۔

ایک اندازے کے مطابق دو حکمرانوں والی اِس سلطنت کے اَسّی فیصد سے زائد باشندے مالی، جسمانی اور ذہنی طور پر بدحال، اپاہج اور مُفلس ہو چکے ہیں۔

تاریخ میں یہ واحد سلطنت ہے جس کے دو حکمران ہیں۔ اِن دو حکمرانوں سے پہلے تک اِس سلطنت کا حاکم ایک ہی بادشاہ ہوتا تھا اور یہی سلطنت جنتِ بے نظیر کہلایا کرتی تھی مگر بادشاہ سے ایک باپ ہونے کے ناتے انجانے میں ایک بھول

ہوئی۔ اُس کے دو جڑواں بیٹے تھے مگر اُس نے اپنے جیتے جی دونوں میں سے کسی کو بھی بادشاہت کے لئے منتخب نہیں کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اپنے اِنتقال سے کچھ پہلے وہ اپنے ایک بیٹے کو بادشاہت سونپ دے گا۔

مگر ہوا یوں کہ بادشاہ اچانک وفات پا گیا۔ دستور کے مطابق تو بڑے بیٹے کو بادشاہ بننا تھا مگر وہ دونوں جڑواں تھے اور بادشاہت حاصل کرنے کے لئے دونوں میں جنگ اور زور آزمائی شروع ہوگئی۔ مگر ایک جیتا نہ دُوسرا ہارا۔ آخر من مانی کرتے ہوئے ایک حاکمِ دن مقرر ہو گیا اور دُوسرا حاکمِ شب۔

دو حکمرانوں والی اِس سلطنت کے باشندگان میں دو سگے بھائی ایسے تھے جن کے درمیان کئی برسوں سے لڑائی، کشیدگی اور تناؤ چلا آ رہا تھا۔ لڑائی، کشیدگی اور تناؤ کی موجودہ وجوہات تو کئی تھیں مگر اُن سب وجوہات کے پیچھے اصل وجہ حق وراثت میں ملنے والا سیب کا وہ بڑا باغ تھا جس کا اِن کے بوڑھے باپ نے اپنے جیتے جی بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ یہاں بھی ایک باپ کی بھول دونوں بھائیوں کے کام آ رہی تھی۔

اکثر باپ وراثت میں اپنی اولادوں کے لئے جاگیر کے ساتھ ساتھ بہت سارے جھگڑے بھی چھوڑ جاتے ہیں۔

اِن دونوں بھائیوں کے باپ کے پاس سیب کے تین باغات تھے جن سے اُسے خاطر خواہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ ایک ایک باغ تو اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کے حوالے کیا مگر تیسرا اور بڑا باغ اُس نے اپنے پاس ہی رکھا۔ اِس خیال اور فکر سے کہ اگر وہ خالی ہو گیا تو اُس کے بیٹے اُس کی بڑھاپے میں عزت اور اچھی دیکھ بھال نہیں کریں گے۔ اگر بڑا باغ اُس کے پاس رہا تو دونوں بیٹے بڑھاپے میں اُس کی خوب خاطر مدارت کرتے رہیں گے اور پھر مرنے سے کچھ ایام قبل وہ بڑا باغ بھی اپنے دونوں بیٹوں میں برابر بانٹ دے گا۔ مگر ہوا یوں کہ اُن کا بوڑھا باپ بیمار ہوا اور باغ کا بٹوارہ کئے بغیر ایک دِن اچانک مر گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد بڑے باغ کے بٹوارے کو

لے کر دونوں بھائیوں میں جھگڑا چل پڑا۔ایک بھائی نے بزورِ بازو اِس بات کو بنیاد بنا کر بڑے باغ پر اپنا قبضہ جما لیا کہ مرنے سے قبل باپ اُس کے ساتھ اُسی کے گھر میں رہ رہا تھا۔لہٰذا وہ بڑے باغ کا تنہا مالک ہے۔

یوں بڑے باغ کے بٹوارے کو لے کر سال ہا سال کی کشیدگی اور تناؤ سے تنگ آکر ایک بھائی نے حاکمِ شب کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کر دیا۔ ردِعمل کے طور پر دُوسرے نے حاکمِ دن کی عدالت میں اپنا دفاعی مقدمہ پیش کر دیا۔

دو حکمرانوں والی اِس سلطنت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اِس کا عدالتی نظام بڑا ہی تیز ہے۔ یہاں دیگر سلطنتوں کی طرح عدالتی معاملات برسوں پر محیط نہیں ہوتے ہیں بلکہ فوری کارروائی ہوتی ہے۔ دونوں ہی حکمران ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے اور ایک دُوسرے کو نیچا دِکھانے کی کوشش میں عوامی معاملات اور جھگڑوں کا فوری طور پر نپٹارہ کرتے ہیں۔

حقِ وراثت کو لے کر دونوں بھائیوں کے درمیان چل رہے جھگڑے کا فیصلہ یوں ہوا کہ یکے بعد دیگرے دونوں حکمرانوں نے اپنے اپنے مدعی کے حق میں فیصلہ کیا اور مجرم کے حصّے میں ڈالی موت۔

فرق صرف اِتنا ہوا کہ ایک کو دِن کے اُجالے میں موت لی اور دُوسرے کو رات کی تاریکی میں۔ یوں بیواؤں کے اکثریت والی اِس سلطنت میں دو اور بیواؤں کا بہ یک وقت اِضافہ ہوا۔اُن ہی میں سے ایک میں ہوں۔ میری مدد کیجئے۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ پھیلا دیئے۔

OOO

علاقے بھر کے حالات خراب تھے، بہت ہی خراب۔ دہشت گردی نام کی ایک نئی جنگ نے سارے علاقے کو بلکہ ملک بھر کو ہی مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ ہر طرح کی چوکسیوں اور پہریداریوں کے باوجود ہر آنے والا دِن ایک نیا دھما کا لے کر آتا تھا۔ روز روز کی فوجی تلاشیوں اور کراس فائرنگ نے لوگوں کی نیندیں تک حرام کر رکھی تھیں۔ کوئی جاسوسی اور مخبری کرنے کے اِلزام میں تو کوئی دہشت گردی اور بغاوت کے الزام میں، اور بہت سارے تو کسی اِلزام کے بغیر ہی جان سے ہاتھ دھو رہے تھے۔

اُدھر سیاست دانوں اور لیڈروں کے خیموں میں بھی پریشانی اور بے چینی کا عالم تھا۔ بہتوں کو تو مُلک بچانے کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی کرسی بھی بچانے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ کیونکہ اپوزیشن والے بھی موقعہ غنیمت جان کر مُلک بچانے کی آڑ میں کرسی ہتھیانے کی کوشش میں نِت نئے اِلزام اور پنگے کھڑے کر رہے تھے۔

غرض یہ کہ سب کے لئے حالات خراب تھے۔ بہت زیادہ خراب اور اِن ہی حالات میں ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے، درمیانے قد کاٹھ کے بڑے میاں صاحب کے گھر کے حالات کچھ زیادہ ہی سنگین تھے۔ اپنی جگہ اُن کی سوچیں اور پریشانیاں پردھان منتری صاحب کی سوچوں اور پریشانیوں سے بھی بڑھ کر تھیں۔

اُن کی بیوی جنت مکانی ہو چکی تھی اور وہ اپنے دونوں بہو بیٹوں کے درمیان فٹ بال بن کر رہ گئے تھے۔ پہلے تو کچھ عرصہ اُنہوں نے بھی چُپ سادھ رکھی کہ کسی طرح خاموشی سے دِن گزر جائیں لیکن بے کار۔ آخر تنگ آ کر وہ گاؤں کے نمبردار کے آگے

فریادی ہوئے۔ ''آپ نمبردار ہیں۔ آپ لوگوں کے مسائل حل کرنے کا حق بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ آپ نے بہت ساروں کے مسائل حل بھی کیئے ہیں۔ اب میری بھی سنو۔ مجھے بھی میری آزمائش میں سے نکالو۔ آخر میرے صبر کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہیے۔ میں بھی زندگی کے آخری دِن سُکھ اور چین کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

نمبردار اور چوکیدار اُن کی خستہ حالی اور گھر کے شور شرابے سے پہلے بھی واقف تھے۔ اُنہوں نے ایک دو کچہریوں میں اُن کے بہوؤں بیٹوں کو بُرا بھلا کہا اور سمجھایا بجھایا۔ اُنہیں آپس میں اِتفاق رکھنے اور بڑے میاں کا کہنا ماننے اور اُن کی خدمت کرنے کے لئے کہا۔ اِس کارروائی کے بعد بڑے میاں بہت ہی خوش ہوئے کہ میں کامیاب ہوگیا ہوں مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اُنہیں معلوم ہوگیا کہ کچہریوں کا اثر اُلٹا ہی نکل رہا ہے۔ اِس لئے اُنہوں نے کچھ دیگر حربے بھی آزمائے۔ بہت ہل جُل کی مگر اُن کی ایک بھی نہ چلی۔ بڑے میاں آخر اِسی نتیجے پر پہنچے کہ اِنسان کو ایک دِن جوان اولاد کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔ بس یہ خیال آتے ہی اُنہوں نے اپنے حصّے کا مکان اور زمین وغیرہ بھی بانٹ کر دونوں بیٹوں کے حوالے کردی اور خوش ہوئے کہ جیتے جاگتے اپنے ہاتھوں یہ فریضہ بھی انجام دے دیا۔ مگر یہ فرض پورا کرنے کے بعد بہو بیٹے بھی خوش ہوں تو تب نا۔ اُنہیں یہ گلہ تھا کہ بڑے میاں نے اُنہیں کم حصّہ دیا ہے اور دُوسرے کو زیادہ۔ بہو بیٹوں نے نہ صرف آپس میں لڑنا جھگڑنا بلکہ بڑے میاں کے ساتھ بھی اُٹھتے بیٹھتے جھگڑنا اور کُڑھنا شروع کر دیا۔ ''بابا! آپ نے مجھے دیا ہی کیا ہے۔ اِنصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔ مگر آپ نے میرے ساتھ اِنصاف نہیں کیا۔'' دونوں بیٹوں کا اُن سے یہی گلہ تھا کہ آپ نے مجھے کم دیا ہے۔

بڑے میاں بیوی کے مرنے کے بعد کچھ زیادہ ہی بیمار رہنے لگے تھے۔ کبھی ٹخنے اور گھٹنے کا درد تو کبھی کھانسی اور بخار۔ دوائی وغیرہ یا کسی دُوسری چیز کی ضرورت کو لے کر وہ جس بھی بہو بیٹے کے پاس جاتے' اُنہیں بس یہی جواب ملتا تھا ''بابا! آپ

نے ہمیں دیا ہی کیا ہے؟" اور بابا صاحب کے پاس اب دینے کے لئے کچھ تھا بھی نہیں اور مانگے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بڑے میاں بڑے ہی دُکھی ہوتے اور یہی سوچتے۔ "مکان، مال مویشی، زمین وغیرہ اور جو کچھ بھی میرے پاس تھا، وہ میں نے انہیں بانٹ کر دے دیا۔ اب اور کیا دُوں اور بہو بیٹوں کو کیسے خوش کروں۔"

اُس روز بڑے میاں کو کھانسی اور بخار نے بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ یوں تو وہ کوئی دو مہینوں سے کھانستے آرہے تھے مگر کسی نے بھی اُنہیں دوائی وغیرہ کے لئے نہیں پوچھا تھا۔ رہ رہ کر بڑے میاں آخر اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس آئے اور کھانستے ہوئے اُسے دوائی لانے کے لئے کہا۔ اِس سے پہلے کہ بیٹا کوئی ہاں یا نہ کہتا، بہو کڑک کر بولی "کیوں بابا! آپ نے ہمیں کچھ زیادہ دیا ہے جو ہر وقت ہمارے ہی پاس مانگنے چلے آتے ہو؟" یہ جواب سن کر بڑے میاں اِنتہائی دُکھی ہوئے اور یہ بھی سمجھ گئے کہ یہ جواب صرف بہو کا ہی نہیں ہے، بیٹے کی طرف سے بھی یہی جواب ہے اور یہی جواب بڑے میاں اپنے بڑے بیٹے اور بہو سے پہلے ہی سُن چکے تھے۔

دُکھی ہو کر وہ بھی کڑک کر بولے "اب میں نئے سرے سے جوان ہوں گا، کمائی کروں گا اور پھر میں تمہیں دُوں گا۔ اِس سے پہلے میں نے جو کچھ بھی کیا وہ رائیگاں ہی گیا نا........؟" "ابھی بہو بیٹا، بڑے میاں کو پتہ نہیں اور کیا کچھ کہتے۔ بڑے میاں نہ جانے اور کتنے دُکھی ہوتے کہ اچانک ہی مسجد سے مائک پر اعلان ہوا۔

"گاؤں کے سبھی لوگ اپنے گھر بار کھلے چھوڑ کر دس منٹ کے اندر ہی بڑی مسجد کے احاطے میں جمع ہو جائیں......"

اِس اعلان کے ہوتے ہی لوگوں میں خوف و ہراس اور افراتفری مچ گئی۔ ایسے اعلان پہلے بھی کئی بار ہو چکے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے اور پھر وہی ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد فائرنگ شروع ہو گئی جو دِن بھر جاری رہی۔ خوف و ہراس میں ڈوبے ہوئے لوگ اپنی اور اپنے عزیزوں اور رِشتہ داروں کی سلامتی اور زِندگی کے

لئے دُعائیں کرتے رہے۔ مگر بڑے میاں فائرنگ کے خوف و ہراس سے بے خبر اور بے نیاز، اپنے ساتھ اپنے بہو بیٹوں کی طرف سے ہونے والے سلوک پر جلتے بھنتے رہے۔ اپنی مرحوم بیوی کو یاد کرتے رہے اور اپنے مرنے کی دعائیں مانگتے رہے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے مسجد کے احاطے میں جمع ہوئے لوگوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے فوجی آفیسر نے کہا۔

''ہم نے بروقت کارروائی کر کے چار دہشت گردوں کو مار گرایا ہے۔ باقی بچے ہوئے دہشت گردوں کو مار گرانے کے لئے ہماری کارروائی رات بھر جاری رہے گی۔ اِس وقت آپ لوگوں کو اپنے اپنے گھروں میں واپس جانے کی اجازت دی جارہی ہے لیکن یہ یاد رکھیں کہ آج شام سات بجے سے لے کر صبح سات بجے تک کوئی بھی سِول آدمی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے کیونکہ ہمارے جوان رات بھر ڈیوٹی پر رہیں گے اور وہ کوئی بھی حرکت دیکھنے پر گولی چلا سکتے ہیں۔ اِس لئے صبح سات بجے تک آپ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کے اندر ہی رہیں۔''

دِن بھر کے بھوکے پیاسے لوگ اِجازت ملتے ہی گرتے سنبھلتے اپنے اپنے گھروں میں جا پہنچے اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ خوف و ہراس میں ڈوبی ہوئی رات چپ چاپ گزرنے لگی۔ کسی بھی طرف سے گولی چلنے کی آواز سنائی نہیں دی۔

کوئی آدھی رات کا وقت تھا کہ گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے بڑے میاں کے دِل میں اچانک ہی ایک نیا مگر بڑا ہی خطرناک خیال آسمانی بجلی کی طرح کوندا اور پھر اُنہوں نے پل بھر کی دیر نہیں کی۔ آہستگی سے دروازہ کھولا اور گھر سے باہر نکل گئے۔

رات کا وہ کوئی تیسرا پہر تھا کہ اچانک ہی تڑا تڑ گولیاں چلنا شروع ہوگئیں۔ لوگوں کے دِل بُری طرح دھڑک اُٹھے۔ ''رات کے اندھیرے میں پتہ نہیں کون سی گولی دیواریں چیر کر سینے میں آ لگے گی۔''

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک گولیاں چلتی رہیں۔ دِل دھڑکتے رہے۔ جسم لرزتے

رہے اور پھر پہلے کی طرح خوفناک خاموشی چھا گئی۔ صبح ہوئی تو آرمی والوں کی طرف سے رپورٹ آئی کہ اُنہوں نے رات کو ایک اور دہشت گرد کو مار گرایا ہے۔

اِدھر بڑے میاں کے چھوٹے بیٹے نے اُن کے کمرے کا دروازہ کھولا اور خالی بستر دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا ''معلوم نہیں کہاں چلے گئے ہیں؟ رات کو تو اچھے بھلے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔'' کچھ ہی دیر بعد رات کے اندھیرے میں مارے جانے والے دہشت گرد کی شناخت اِسی گاؤں کے رہنے والے دو بیٹوں کے باپ حسن محمد عرف ''بڑے میاں'' کے طور پر ہوئی۔ شناختی کارڈ کے علاوہ اسلحہ کے طور پر اُن کے پاس سے ایک تیل پلائی اور چھام چڑھائی لاٹھی بھی ملی۔

بڑے میاں کی بہوئیں اور بیٹے اُن کی لاش سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگے، افسوس کرنے لگے اور پوچھنے والوں کو بتانے لگے کہ بڑے میاں رات کو اچھے بھلے راضی خوشی لیٹے تھے۔ اُن کے کھانسنے کی آواز بھی ہم سنتے رہے۔ پھر پتہ نہیں کس وقت اور کیوں وہ اپنے گھر سے آدھا میل دُور جا پہنچے۔ اُنہوں نے فوجی آفیسر کی باتیں بھی اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ پتہ نہیں پھر کیوں باہر نکلے؟ اُنہیں کوئی ساتھ لے گیا یا پھر دہشت سے بے ہوشی کی حالت میں یہ گھر سے باہر نکل گئے۔''

سب لوگ ہکے بکے تھے۔ کسی کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ بڑے میاں کے ساتھ کیا گزری۔ اپنی اپنی جگہ ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ فوجی آفیسر کی ہدایات کے باوجود بڑے میاں رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے آدھا میل دُور کس طرح جا پہنچے اور کس طرح گولیوں کا شکار ہوئے۔

بڑے میاں کی موت گھر اور باہر والوں کے لئے ایک راز بن گئی تھی اور یہ راز صرف اور صرف بڑے میاں ہی جانتے تھے کہ اُنہوں نے اپنی بہوؤں اور بیٹوں کے لئے ایک لاکھ روپے کا اِنتظام جان بوجھ کر اور پورے ہوش وحواس کے ساتھ کیا تھا۔

○○○

والوں کی صلاحیتوں کو جِلا بخشے اور پروان چڑھائے' نہ کہ اُن کے لئے ''تم جیسے'' الفاظ اِستعمال کر کے اُن کی حوصلہ شکنی کرے۔

آقا! آپ نے حقیر معنوں میں میرے لئے ''تم جیسے شاعر'' الفاظ اِستعمال کئے ہیں۔ آپ کی نظر میں اگر میں اعلیٰ پائے کا شاعر نہیں ہوں تو کیا میں شاعری چھوڑ دُوں؟ جب کہ کہا جاتا ہے کہ مشق سے آدمی پختہ ہوتا ہے۔ کچھ رہنمائی اور حوصلہ افزائی ملے تو سونے پر سہاگا اور اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں شاعری چھوڑ دُوں تو پھر بتائیے میں آخر کیا کروں؟ کوئی کاروبار کروں تو اُس کے لئے اثاثہ چاہیے جو کہ میرے پاس ہے نہیں۔ نوکری کے لئے اِنٹرویوز دیتا ہوں تو مقابلہ اِتنا شدید ہوتا ہے کہ پوچھئے مت۔ کہتے ہیں بے کار دِماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ اِس لئے میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا کہ چلو شاعر ہی بنتے ہیں۔ اِس میں پیسے بھی نہیں لگتے ہیں اور دِل بھی لگا رہتا ہے۔ نیز آدمی دیگر کئی طرح کے جھمیلوں اور پریشانیوں سے بچا رہتا ہے اور آپ ہیں کہ میرے لئے بارہا ''تم جیسے شاعر'' الفاظ اِستعمال کر کے میری دِل شکنی کر رہے ہیں۔

مگر حضرت! یقین جانئے' میں بھی خاصے کی چیز ہوں۔ میں آپ کی کھری کھوٹی سے مجروح ہو کر خاموش بیٹھنے والا نہیں ہوں۔ آپ نے میرے مجموعۂ کلام کے لئے تقریظ لکھنے سے اِنکار کیا تو کیا؟ شائقین تو شاعر کے دامن سے لپٹنے میں فخر سمجھتے ہیں۔ شاعر کے نام سے اپنا نام جوڑنا باعثِ اِفتخار سمجھتے ہیں اور ہاں' آپ نے تقریظ نہ لکھنے کا بہانہ یہ بنایا کہ تقریظ لکھوائی نہیں لکھی جاتی ہے اور یہ کہ تقریظ لکھنے کا اہل وہی شخص ہوتا ہے جو شاعر کو رُوبرو جانتا ہو۔

مگر آقا! میرا ماننا ہے کہ تقریظ لکھی بھی جاتی ہے اور لکھوائی بھی جاتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح جو چیز بازار میں دستیاب نہیں ہوتی ہے' وہ باہر سے منگوائی جاتی ہے اور پہچان کے لئے سیمپل ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ سیانوں کے خیال میں چاول

کچے ہیں یا پکے، جاننے کے لئے ایک دو دانوں کو ہی پرکھا جاتا ہے۔

آقا! میرے خیال میں کسی کی تصویر بنانی ہو یا خاکہ لکھنا ہو تو ضروری ہوتا ہے کہ اُس شخصیت کا مکمل تعارف حاصل ہو اور اُسے رُوبرو دیکھا ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ تقریظ لکھوانے کا مطلب صرف تعریف وتوصیف کروانا ہی ہوتا ہے کیونکہ کوئی جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اُس کی یہ خواہش ہرگز نہیں ہوتی ہے کہ آئینہ اُسے بدل کر پیش کرے۔ آئینہ تو اصل عکس ہی دِکھاتا ہے اور دیکھنے والا بھی یہی چاہتا ہے کہ آئینہ اُسے اُس کا سراپا دِکھائے اور آپ نے میری خواہش کو محض تعریف کروانا ہی گردان کر اپنا پلہ جھاڑ دیا۔ یہ آپ کی معلّمی شان کے خلاف ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ ''میں آپ کا نام اور کلام شنیدہ نہیں ہوں۔'' تو اِس ضمن میں عرض یہ ہے کہ یہ دُنیا بڑی وسیع ہے۔ اِس میں رہتے ہوئے ایک دُوسرے سے تعلقات بڑھانے پڑتے ہیں۔ نیز ایک اِنسان دُوسرے اِنسان کے ذریعہ سے دُوسروں سے متعارف ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے اور اگر ہر کوئی دُوسرے کے کام آنے سے اپنا پلہ جھاڑتا رہے تو پھر ہر کوئی اپنی محدود دُنیا میں سمٹ کر رہ جائے۔

آقا! مشاعروں میں میرے نہ پہنچنے کی جو بات آپ نے کہی ہے تو عرض یہ ہے کہ ہر کوئی ہر مشاعرہ کی زینت نہیں بن سکتا ہے، کیونکہ الادین کا چراغ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا ہے اور پھر جس کی جہاں پہنچ ہوتی ہے وہ وہیں پہنچ سکتا ہے۔ نیز جن ہائی فائی مشاعروں میں آپ شمولیت کرتے ہیں تو ظاہر ہے ہر کوئی جمپ کر کے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ ایک ایک زینہ عبور کرنا پڑتا ہے۔ مان لو کوئی لڑھک بھی جاتا ہے تو صحت مند لڑھکنے والوں کا ہاتھ تھام لیتے ہیں مگر آپ نے یہ کیسا مظاہرہ کیا؟ ہاتھ پکڑنا تو دُور رہا، پلو بھی نہیں چھونے دیا۔

آقا! آپ نے جن کامل اور برگزیدہ ہستیوں کے ناموں اور کارناموں کا ذِکر کیا ہے اُس سے میری معلومات میں اِضافہ ہوا ہے۔ میں آپ کے علم اور مطالعے سے

بے حد متاثر ہوا ہوں اور داد دیتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے وقت کی پیداوار اور ضرورت ہوتا ہے۔ اپنے خط میں آپ نے جن جن کاملین کا ذِکر کیا ہے، وہ اپنے وقت کے بادشاہ تھے اور اپنے وقت کی زینت تھے۔ آنے والی دُنیا کو اُنہوں نے مستفید کرنا تھا۔ آج میں اور میرے جیسے شاعر اپنے وقت کی پیداوار ہیں اور اپنے وقت کی ضرورت بھی۔ لہٰذا آپ کی بے اعتنائی اور بے مروتی سے میں اپنے مشغلے سے ہرگز باز آنے والا نہیں ہوں اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ

ع - چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی!

○○○

اور منگنی ٹوٹ گئی

''رِشتے آسمانوں پر طے ہوتے ہیں''لیکن جوڑی جب بے ہنگم اور بے میل ہوتو میرا دِل دُکھنے اور کُڑھنے لگتا ہے۔ جوڑی بھلے ہی خوشحال ہو مگر ایسی جوڑی کو دیکھتے ہی میں بے حال ہو جاتی ہوں اور میری مزید پرابلم یہ ہے کہ سوشل ورکر ہونے کے ساتھ ساتھ رِشتہ دار ہونے کی وجہ سے میرا ہی اِنتخاب کیا گیا کہ میں ایک ایسی بے ہنگم اور بے میل سی جوڑی کو' جس پر''حور کے ساتھ لنگور'' والا محاورہ فِٹ بیٹھتا ہو' وجود میں لانے کا ایک خاص ذریعہ بنوں۔

لڑکے والوں نے نہایت ہی رازدارانہ طور پر مجھے یہ کام سونپا تھا کہ لڑکی کے قریب ہونے کے ناطے مَیں نہ صرف لڑکی کا عندیہ معلوم کروں بلکہ اُسے یہ رِشتہ قبول کرنے کے لئے راغب بھی کروں مگر میں اِس کارِ خیر کے لئے کسی طور بھی دِل سے تیار نہیں ہو پا رہی تھی۔

بھلے ہی لڑکے والے میرے رشتہ داروں میں سے تھے اور لڑکی سے میری کسی بھی طرح کی کوئی رِشتہ داری نہیں تھی۔ البتہ جان پہچان ضرور تھی اور اسی جان پہچان کی وجہ سے ہی لڑکے والوں نے مجھے بارہا کہہ کر مجبور کر دیا کہ میں لڑکی کو یہ رِشتہ قبول کرنے کے لئے تیار کروں۔ اگر لڑکی نہیں بھی مانتی ہے تو بھی لڑکے اور اُس کے گھر والوں کی سبھی اچھائیاں لڑکی پر واضح کروں اور شادی کے بعد کے حالات کی بھی ذِمہ داری اپنے اُوپر لے لوں اور جس طرح سے بھی ہو سکے' میں یہ رِشتہ جوڑ کر ہی دم لوں۔

بے شک لڑکا با اخلاق و با کردار تھا۔ اچھی پوسٹ پر تعینات تھا۔ مستقبل

قریب میں اُس کی مزید ترقی کے چانس تھے۔ خاندان قدرے امیر اور شریف تھا۔ تین بھائی تھے اور تینوں ہی برسرِ روزگار تھے۔ مجھے لڑکی کے سامنے کسی قسم کا بھی جھوٹ بولنے یا اُسے کوئی دھوکہ دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن پھر بھی میرا دِل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اگر یہ رِشتہ کسی اور کے وسیلے سے طے پا بھی جاتا ہے تو بھی میں خود پوشیدہ رہ کر اُسے بگاڑنے کا کام صدق دِلی سے انجام دُوں۔ اِسی لئے میں کتنا ہی عرصہ لڑکے والوں کو ہاں کہہ کر بھی چُپ سادھے رہی اور پھر ایک دِن یہ تجویز نکالی ''کیوں نہ لڑکے والوں کو اپنے پاس ہی سے یہ جواب دے کر خاموش کر دُوں کہ لڑکی کسی طور پر بھی نہیں مانتی ہے بلکہ آپ کے لڑکے میں بیسیوں عیب بھی ڈُھونڈتی ہے۔''

پھر سوچا کہ کہیں بعد میں اصلیت ظاہر ہوگئی تو؟

''تو بڑی رسوائی ہوگی اپنی۔''

''تو پھر جو باتیں میں اپنے منہ سے کہنا چاہتی ہوں کیوں نہ پہلے وہ لڑکی کے منہ سے ہی کہلوائی جائیں۔'' بس اِسی تجویز کو مناسب جان کر میں نے ہمت جتائی۔ ظاہر ہے کسی کے رُوبرو ہو کر اُسی کی شان کے خلاف بات کرنے کے لئے جرأت و ہمت کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے اور مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین بھی تھا کہ میری بات سُن کر لڑکی بھڑک اُٹھے گی اور کچھ بعید نہیں کہ وہ مجھے بُرا بھلا بھی کہہ دے۔ چونکہ وہ لڑکے سے انجان نہیں تھی۔ دونوں ہی ایک دُوسرے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔

''تو مجھے اپنی بات لڑکی کے سامنے کس طرح پیش کرنی چاہیے؟'' میں نے مارے ڈر کے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گی بلکہ لڑکے والوں کی طرف سے ہی کہوں گی۔ یوں وہ جو بھی بُرا بھلا کہے گی، اُنہی کو کہے گی جو اُس کے بارے میں سوچتے ہیں۔

پھر کئی دِنوں کی تیاری کے بعد جب میں نے اندر سے ڈرتے ڈرتے لڑکی کے سامنے شادی کی بات رکھی تو میری اُمید اور یقین کے بالکل برعکس لڑکی مُسکرادی

اور کچھ حد تک شرما بھی گئی۔ اُس کی مُسکراہٹ اور شرماہٹ سے میرا یہ ڈر تو دُور ہوا کہ میں بے آبرو ہونے سے بچ گئی لیکن میں ایک نئے خوف سے دوچار ہوگئی۔

''اگر یہ لڑکی اِس شادی کے لئے مان ہی گئی تو!''

اِسی خوف سے میں نے چُپ سادھ لی مگر کچھ ہی عرصہ بعد لڑکے والوں نے مجھے پھر سے آن گھیرا۔ ''ہمیں کوئی جواب نہیں ملا۔''

''میں بات چلا رہی ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر کوئی دو، دو ماہ کے وقفہ سے میں نے لڑکی کے سامنے تیسری بار شادی کی بات رکھتے ہوئے کہا ''وہ لوگ تمہیں بہو بنانے کے لئے ترس رہے ہیں اور بہت ہی بے چین ہیں۔ وہ تمہاری مرضی جاننا چاہتے ہیں۔'' پہلی بار تو وہ مُسکرادی تھی۔ دُوسری بار اُس نے کہا ''ابھی شادی کرنے کا کچھ موڈ نہیں بنتا ہے۔'' اور اب تیسری بار اُس نے کہا ''جیسا میرے والدین کریں گے۔ اُنہیں میرے والدین سے رجوع کرنا چاہیے۔''

تب میں نے خود کو بُری طرح کوس ڈالا۔ ''میں کیوں اِس کی شادی میں رُکاوٹ بن رہی ہوں۔ میں نے تین بار شادی کی بات کرنے کے لئے خوامخواہ ہی چھ مہینے لگا دیئے۔ اگر خود اُس کی اپنی مرضی نہیں ہوتی تو یہ آرام سے مُکر جاتی، کوئی سا بھی بہانہ بنا کر۔ اِسے یہ لڑکا پسند ہے۔ جبھی تو یہ فیصلہ والدین پر چھوڑ رہی ہے۔''

پھر بھی لڑکے والوں تک لڑکی کا یہ جواب پہنچانے میں، میں نے اور دو ماہ کی تاخیر کر دی۔ لڑکی کی طرف سے حوصلہ افزا جواب سُن کر بے حد خوش ہوتے ہوئے اُنہوں نے کہا ''شادی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے لڑکا لڑکی مان جائیں، پھر والدین مان ہی جاتے ہیں۔ ہم بھی تو اپنے لڑکے کی خواہش پر ہی اِتنا زور لگا رہے ہیں۔''

اور پھر میری حیرت کی اِنتہا نہ رہی جب لڑکے والوں نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''لڑکی کے والدین نے سوچنے کے لئے کچھ وقت مانگا ہے۔''

''گویا اُنہیں بھی یہ رِشتہ منظور ہے، جبھی تو یہ جواب دیا ہے۔''

میں سوچ میں پڑگئی۔ ''اب کیا کروں ؟ کچھ بھی تو نہیں کیا جا سکتا ہے اور پھر لڑکی کو سب کچھ پسند ہے تو میں کیوں بے چین ہو رہی ہوں۔ میری بلا سے۔'' میں خاموش ہوگئی۔ چند ہی ماہ بعد مجھے لڑکے والوں کی طرف سے منگنی کی رسم میں شامل ہونے کا پیغام مِلا۔ ''اُف !'' میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ واقعی رِشتے آسمانوں پر طے ہوتے ہیں۔ جبھی تو زمین پر دِل ایک دُوسرے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور دو اجنبی ایک نئے رِشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

لڑکی خوش شکل، دراز قد، باسلیقہ اور با ادب تھی۔ جب کہ لڑکا عام سی شکل و صورت والا، اچھی پوسٹ پر تعینات اور والی بال کھیلنے کا شوقین تھا۔ مِڈل اسکول میں پڑھتے ہوئے جب وہ تیز رفتار بال کو پکڑنے کے لئے اُسی رفتار سے بھاگتا تو دونوں گڈ مڈ ہو جایا کرتے۔ پتہ نہیں چلا کرتا تھا کہ کون کیا ہے اور پھر میری شادی ہوگئی۔ میٹرک کے بعد وہ پڑھنے کے لئے شہر چلا گیا اور جب کئی سالوں بعد میں نے اُسے دیکھا تو سوائے گھنی داڑھی مونچھوں کے اُس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اب بھی والی بال اور اُس میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اپنی تعلیمی صلاحیت کے لحاظ سے بڑی پوسٹ پر تعینات ہوا تھا مگر قد کا چھوٹا، یعنی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی چھوٹا رہا تھا اور مجھے یہی خلش ہو رہی تھی کہ ایک خوبصورت اور دراز قد لڑکی کا اِس چھوٹے قد کے لڑکے سے کیا میل جوڑ؟

میں نے بہانہ بنا کر منگنی کی رسم میں شامل ہونے سے اِنکار کر دیا تھا۔ کیسے شامل ہوتی ؟ اب تک جو کیا تھا، اُسی پر دِل کڑھتا تھا اور پچھتاوا ہوتا تھا مگر دھوم دھام سے منگنی ہوئی اور سوائے میرے شاید کسی کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔ البتہ جھٹ پٹ شادی والی بات نہ ہوئی۔ دو سال بعد شادی ہونا قرار پائی۔ اب ڈھکی چھپی کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی خاموشی تھی بلکہ سناٹا تھا۔

چنانچہ رہ رہ کر خود میں نے کتنوں سے ہی اِس نامناسب اور بے میل جوڑی

کا ذکر چھیڑا مگر کوئی توجہ بھی دے تو تب نا۔ ایک آدھ نے کیڑا نکالا۔ ''لڑکی کی کوئی خامی یا مجبوری ہوگی۔'' اور ایک آدھ نے کہا ''اچھی پوسٹ ہے۔''

''بس اچھی پوسٹ.........! ایک اچھی پوسٹ کے لئے بھلا اِتنا بڑا خسارہ مول لے لیا جائے۔'' لیکن میری یہ بات کسی کے پلّے نہیں پڑ رہی تھی۔ میں تو یہ چاہتی تھی کہ کوئی دُوسرا لڑکی کو سمجھائے کہ وہ سب اچھی باتوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف لڑکے کا قد ناپے اور پھر فیصلہ کرے۔ مگر یہ بات کوئی بھی اُس تک پہنچانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ جب لڑکی کو سب کچھ پسند ہے تو پھر ہم کیوں مجرم بنیں؟ اور بہت سوں کے لئے تو یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔ میں خود حیران تھی کہ شادی کی باتیں اگر چھیڑ دی جائیں تو لڑکی بڑی توجہ اور خوشی سے سُنتی تھی اور ناراضگی یا ناپسندیدگی کا ذرا بھی اِظہار نہیں کرتی تھی۔ منگنی کے بعد دو سال پورے ہوئے تو چھ ماہ اور بڑھانے پڑ گئے چونکہ لڑکی کی دادی کا اِنتقال ہو گیا تھا اور بقول لڑکے کے ''وہ اُس لڑکی سے شادی کرنے کے لئے سالوں تک اِنتظار کر سکتا ہے۔''

پھر ایک دِن اچانک میں نے سُنا کہ منگنی ٹوٹ گئی ہے اور خود لڑکی والوں نے باقاعدہ طور پر اِس اعلان کے ساتھ منگنی توڑی ہے کہ لڑکے والے کسی دُوسرے معتبر شخص کو ساتھ لے کر آئیں اور منگنی کی رسم میں ہونے والا اپنا خرچ وصول کر لیں۔

''چلو اچھا ہوا!'' میں نے راحت کی سانس لی۔ مگر ایسا ہوا کیونکر؟ یہ جاننے کے لئے میں نے لڑکی سے پھر سے رابطہ کیا تو لڑکی نے کہا۔

''منگنی ٹوٹنے کا آپ کو سخت دُکھ ہوا ہوگا آنٹی۔ مگر میں آپ کو سچ بتاتی چلوں کہ میں چھوٹے قد کے لوگوں کو پسند نہیں کرتی ہوں اور میرا ماننا تو یہ ہے کہ چھوٹے قد کے لڑکے اور لڑکیوں کو شادی ہی نہیں کرنی چاہیے اور اگر شادی کر بھی لیں تو کم از کم بچے پیدا کرنے سے اُنہیں مکمل پرہیز کرنا چاہیے اور بچوں کی خواہش کی تکمیل کے لئے یا خواہش کو دبانے کُچلنے کے لئے ہی، کوئی بھی غریب یا یتیم بچہ گود لے لینا چاہیے۔ اِس

دُنیا میں غریب اور بے سہارا بچوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ بس میں نے یہی بات لڑکے کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ تم تینوں بھائی قد میں اپنے چھوٹے قد کے باپ کی برابری بھی نہیں کر پائے اور اب تمہارے ہونے والے بچوں کے قد شاید تم سے بھی چھوٹے ہی رہیں۔ لہٰذا تم شادی سے اِجتناب کرو یا پھر مجھے یہ یقین دِلاؤ کہ تم بچے پیدا نہیں کرو گے۔ مگر آنٹی! اُس نے میری بات کو فضول سی سوچ کہا اور اِس بات پر زور دیا کہ وہ کم سے کم آدھا درجن بچوں کا باپ بننا پسند کرے گا۔ بس یہیں سے بات بگڑ گئی اور میں نے اپنے امّی ابو کو اچھے ڈھنگ سے بات سمجھاتے ہوئے کہا کہ میں اُس چھوٹے قد کے لڑکے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ بس امّی ابو نے میری بات مان لی اور منگنی ٹوٹ گئی۔''

''تو تمہیں پہلے دِن سے ہی اِنکار کر دینا چاہیے تھا۔'' میں نے لڑکی کو کُریدا تو دھیرے سے مُسکراتے ہوئے اُس نے کہا۔

''آنٹی! آپ کو ایک اور سچ بتاتی چلوں کہ میں نے جان بوجھ کر یہ ڈرامہ کھیلا ہے۔ میں اب بھی دو سال بعد شادی کی بابت سوچوں گی۔ میری ابھی عمر ہی کیا ہے؟ مگر میں نے اُس کے لگ بھگ تین سال ضائع کر دیئے ہیں۔ اُسے لٹکائے ہی رکھا ہے میں نے، اور مجھے لگتا ہے کہ وہ اب بھی کسی لمبے قد کی لڑکی کا ہی اِنتخاب کرے گا اور میں اُس لڑکی کو بھی سمجھا دُوں گی کہ وہ بھی اُس کے مزید کچھ سال برباد کر دے۔ یوں یہ بوڑھا ہوتا جائے گا۔ میں اُس چھوٹے سے قد کے لڑکے کی شادی کہیں بھی نہیں ہونے دُوں گی۔''

لڑکی کا یہ اِنکشاف سُن کر میں دنگ رہ گئی اور دِل ہی دِل میں کہہ اُٹھی۔

''واہ رے لڑکی! تم تو مجھ سے کئی قدم آگے نِکل گئی ہو۔ شاید اِس لئے کہ تم لڑکی ہو اور میں آنٹی۔''

○○○

اب کیا ہوگا؟

پچھلے دو دِنوں سے لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کی طرح بڑے شہر سے خاصی دُوری پر واقع ایک پہاڑی پر بسے ہوئے گاؤں کے رہنے والے نعیمہ اور شارب بھی لگاتار ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے چپکے ہوئے تھے۔

ایک اہم اور بے حد حسّاس مسئلے کو لے کر دونوں پڑوسی ملکوں کے سربراہوں کے درمیان ہو رہی ملاقات یقیناً سب کے لئے بڑی اُمید افزا تھی اور خاص طور سے وہ لوگ جو دونوں ملکوں کے باہمی ٹکراؤ کا شکار ہو چکے تھے اور جواب بھی ہو رہے تھے، جنہوں نے اپنے عزیز و اقارب کھوئے تھے، جو اپنے گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، ایسے لوگوں کے لئے تو یہ ملاقات کہیں زیادہ پُراُمید، خوش کُن اور باعثِ راحت تھی۔

نعیمہ اور شارب کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا تھا جو پشت در پشت جنگی تباہ کاریوں کا شکار ہوتے چلے آ رہے تھے۔ اُن کے دادا دادی نے ۱۹۴۷ء کی ہولناکیوں کو سہا تھا۔ اُن کے ماں باپ ۱۹۶۵ء میں اُجڑے اور پھر بسے تھے اور اب وہ خود گزشتہ کئی برسوں سے نہایت ہی خطرناک اور دہشت زدہ حالات سے دوچار تھے۔

گاؤں کے چند لوگ، جن کے پاس زادِ راہ تھا، وہ گھربار چھوڑ کر شہر میں جا بسے تھے۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرنے والے لوگوں میں سے بھی اکثر نے شہر میں ہی اپنا ٹھکانا ڈھونڈ لیا تھا مگر درمیانہ طبقے کے وہ لوگ جو اکثریت میں تھے، وہ خوفناک حالات میں بھی اپنے اپنے گھربار سے چپکے ہوئے تھے۔

اُن کے دِن اُداس اُداس اور راتیں سہمی سہمی تھیں۔ کسی بھی وقت دستک ہو

سکتی تھی۔ کسی بھی وقت گھیراؤ اور تلاشی ہو سکتی تھی۔ کسی بھی وقت کراس فائرنگ ہو سکتی تھی اور نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی اپنے گھر بار چھوڑنے سے مجبور تھے۔ ایک ایک کر کے گھر بار چھوڑنے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے اُنہیں کوئی پناہ گاہ مل نہیں رہی تھی۔ اپنے پاس کچھ زادِ راہ تھا نہیں اور وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر بے سروسامانی کی صعوبتیں اُٹھانے سے بچنے کی کوششوں میں' باوجود خطرناک حالات کے اپنے گھر بار سے ناتا جوڑے ہوئے تھے۔ ملاقات کے حوالے سے میڈیا والوں کی طرح ہر کوئی اپنی اپنی سوچ اور اندازے کے مطابق اظہارِ رائے کر رہا تھا۔ ٹی.وی سے حاصل جانکاری کے مطابق نعیمہ نے کہا ''صدرِ پاکستان کی آمد کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے ہر طرح سے اعلیٰ اِنتظامات کئے گئے ہیں۔ خوب خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ ممکن ہے وہ خوش ہو کر کوئی بات مان لے!'' شارب نے کہا ''اگر نہیں مانے گا تو ہمیں بھگتنا ہی پڑے گا!'' ''وہ کیسے؟'' نعیمہ چونک اُٹھی۔

''گھس پیٹھ جاری رہے گی اور ہمارے دروازوں پر دستک ہوتی رہے گی۔'' شارب نے آہستگی سے جواب دیا۔ نعیمہ دستک کے خیال سے ہی ہراساں ہو گئی اور جلدی سے بولی ''اللہ کرے وہ ہر بات مان لے۔''

جب سے ریاست کے حالات خراب ہوئے تھے' رات کے وقت دروازوں پر ہونے والی دستک نے لوگوں کو بے حد دُکھی کر رکھا تھا۔ دستک کے خوف سے اُن کی نیندیں تک اُچاٹ تھیں۔ دستک ہی کے نتیجے میں بہت سے دِل دہلا دینے والے منظر ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ کتنے ہی گھر راکھ اور ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے اور کتنے ہی بھرے پُرے' ہنستے بستے گھر اب ویرانی اور اُداسی کا عکس پیش کر رہے تھے۔

دونوں لیڈروں کی ملاقات کا وہ تیسرا اور آخری دِن تھا۔ ضرور کوئی سمجھوتہ طے پانے والا تھا۔ لوگ بے صبری سے پَل پَل کا اِنتظار کر رہے تھے اور ایک دُوسرے سے پوچھ رہے تھے ''اگر کچھ بھی طے نہیں ہو پایا تو کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟'' اور اِس ''کیا

ہوگا'' کا جواب دینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ گاؤں کے کچھ بھولے بھالے اور اَن پڑھ لوگ تو سیانوں سے یوں پوچھتے پھر رہے تھے ''ہوا فیصلہ؟''

مگر سویرے سے ہی دونوں اطراف کی خوشگوار فضا مایوسی میں بدل گئی تھی۔ دونوں اطراف سے کشیدہ کشیدہ بیانات آنے لگے تھے۔ سرحد پار والے محترمہ سُشما سوراج کے کسی بیان پر ناراض ہو چکے تھے اور اب دُوردرشن پر ایک اِنٹرویو میں محترمہ اپنی صفائی میں بول رہی تھیں اور پھر بولتے بولتے وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ نعیمہ دونوں اطراف کی ابر آلود فضا سے خاصی دُکھی ہو چکی تھی۔ وہ بڑبڑا اُٹھی ''ہنھ! سوراج بی بی، تمہاری بیان بازی پر وہ پہلے سے ہی ناراض ہوئے بیٹھے ہیں اور اب تم ہنس ہنسا کر اُن کی ناراضگی کا مذاق اُڑاؤ اور قہقہے لگاؤ۔ مرہم پٹی کے بہانے اُنہیں اور نشتر چبوتی جاؤ اور قہقہے لگاتی جاؤ۔ تمہیں کیا ہے۔ بھگتنا تو ہمیں ہی ہے۔ دستک تو ہمارے دروازوں پہ ہوگی نا!''

دِن گزر گیا اور شام تک بھی کچھ طے نہیں ہو پایا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد نعیمہ نے ٹی.وی سیٹ کے سامنے سے اُٹھتے ہوئے کہا ''مجھے لگتا۔ ہے کہ برسوں بعد منعقد ہونے والی یہ ملاقات اب رائیگاں جانے والی ہے۔ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو پائے گا۔ اب میں اپنی نیند رائیگاں نہیں ہونے دُوں گی۔ میں سونے جا رہی ہوں۔'' شارب اُس کی اِس بات سے چڑ گیا اور بولا ''تمہاری سوچ ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ بہت جلد فیصلہ صادر کر دیتی ہو۔ مگر میں مثبت انداز میں سوچنے والا آدمی ہوں۔ مجھے اب بھی اُمید ہے کہ کوئی نہ کوئی معاہدہ طے پا ہی جائے گا۔ جب تک ٹی.وی پر پروگرام چل رہا ہے، میں سُنتا ہی رہوں گا۔ کوئی نہ کوئی فیصلہ کروا کے ہی نیند کی بابت سوچوں گا۔'' نعیمہ سر کی جنبش کے ساتھ 'ہُنھ' کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چل دی۔ پھر نہ جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا، دروازے پر ہونے والی دستک نے اُنہیں گہری نیند سے ایک جھٹکے سے جگا دیا۔

دونوں کا دل بے طرح دھڑک اُٹھا۔ ''اوہ! اب کیا ہوگا؟''

جس خطرے سے بچنے کے لئے وہ لاکھ حیلے، جتن اور دُعائیں کرتے آ رہے

تھے وہ اب اُن کے سر پہ منڈلا رہا تھا مگر وہ خود اپنے بستروں سے ہل نہیں پا رہے تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ یوں ہی ساکت و جامد پڑے رہے۔ آخر نعیمہ دھڑکتے دل اور دبے قدموں سے اپنے بستر سے نیچے اُتری اور شارب کے کمرے کی طرف کھسکنے لگی۔ ابھی وہ درمیانے دروازے تک ہی پہنچ پائی تھی کہ اُسے شارب کی پھولی ہوئی سانسیں سنائی دیں۔ ایک دُوسرے کے دِل کی دھڑکنیں اور پھولی ہوئی سانسیں سن کر دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر ایک دُوسرے کو تھام لیا اور دروازے سے ذراہٹ کر ننگے فرش پر ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ دونوں کے ہونٹ سِلے ہوئے تھے۔ وہ باہر والوں کو اپنی موجودگی کا احساس نہیں دِلانا چاہتے تھے مگر دِل بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ مانو وہ کڑکتی دُھوپ میں منوں بوجھ اُٹھائے کسی پہاڑی پر چڑھے جا رہے ہوں۔

خوفناک سوچوں اور خیالوں میں گم سم کتنی ہی دیر تک وہ ساکت و جامد بیٹھے رہے۔ اَن گنت خیالوں میں نعیمہ کو اپنے بچوں کا خیال آیا۔

''شکر ہے آج ہمارے بچے یہاں نہیں ہیں۔ نہ جانے کس کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ کتنے ہی گھروں میں تو ہارٹ اٹیک کے واقعات رُونما ہو چکے ہیں اور آج یہاں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو جائے، کسی کو کوئی خبر نہیں ہوگی۔ ہم چاہے کتنا ہی چیخیں اور چلائیں، ہمارا کوئی بھی پڑوسی اپنی کھڑکی کا ایک پٹ بھی نہیں کھولے گا.........''

اب باہر خاموشی تھی۔ نہ کوئی آہٹ، نہ کھنکھناہٹ اور نہ ہی دستک۔ پچھلے کچھ عرصہ سے نعیمہ اِن معاملات میں خود کو شارب سے کچھ دلیر سمجھنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شارب کا خیال آتے ہی بستر سے اُٹھنے کی اُس میں ہمت پیدا ہو گئی تھی، تاکہ وہ شارب کے کمرے میں جا کر اُس کا اتہ پتہ معلوم کرے، کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہو گیا ہو۔ حالانکہ شروع شروع میں خود وہ کہیں دُور پار کی فائرنگ سے ہی خوفزدہ ہو کر بے ہوش ہو جایا کرتی تھی مگر اب شاید روز روز کے حادثات اور واقعات نے بہت سے اور لوگوں کی طرح اُسے بھی کچھ دلیری بخش دی تھی مگر شارب اب بھی بہت خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا

اور اِس سے پہلے کہ نعیمہ اُس کے پاس پہنچتی وہ محفوظ مقام کی تلاش میں خود اُسی کے کمرے کی طرف آرہا تھا اور اب وہ دونوں ایک دُوسرے کے سہارے فرش پر بیٹھے تھے۔ دل اگرچہ دونوں کے بے قابو ہوئے جارہے تھے مگر خود وہ کوئی سرگوشی تک کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہے تھے۔ بس وہ چپ تھے اور آنے والے خطرناک لمحات کے منتظر تھے۔ شارب کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر تک جب باہر سے کوئی آہٹ نہ سنائی دی تو نعیمہ نے شارب کو حوصلہ دینے کی غرض سے کہا۔

''وہ لوگ اب چلے گئے ہیں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔''

نعیمہ یہ تو بخوبی جانتی تھی کہ اگر سچ مچ کے وہی لوگ ہیں تو پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ دروازہ کھلوائے بغیر کہیں اور چلے جائیں مگر دِل کے خوش کرنے کو یہ خیال ہی کافی تھا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ جواب میں شارب نے تصدیق چاہی۔

''کیا واقعی وہ چلے گئے ہیں؟''

''ہاں! بالکل چلے گئے ہیں اور مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی ہمیں ڈرانے کی کوشش کررہا تھا۔ اگر سچ مچ وہی لوگ ہوتے تو اب تک دروازہ توڑ چکے ہوتے۔''

''ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' شارب نے بھی جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔ دونوں نے باتیں بھی سرگوشیوں میں کیں۔ شارب سوچوں ہی سوچوں میں خود کو کبھی بیلٹ فورس والوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا پاتا تو کبھی گولیوں اور دھماکوں کی زد میں آئے ہوئے اپنے مکان سے لاوے کی طرح اُٹھتے ہوئے دھوئیں کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا۔ نعیمہ نے دِل ہی دِل میں دونوں سربراہوں کو کوسا۔ ''کاش! تم لوگ اِس وقت ہماری حالت دیکھ لیتے۔ کاش تم یہ جان پاتے کہ ہم سالہا سال سے کس خوف اور دہشت سے دوچار ہیں اور آج خوف اور دہشت کے عالم میں بستر کے بجائے یوں ننگے فرش پر پڑے ہیں۔ نہ جانے آج ہماری صبح بھی ہوگی یا نہیں........؟''

تھے وہ اب اُن کے سر پہ منڈلا رہا تھا مگر وہ خود اپنے بستروں سے ہل نہیں پا رہے تھے۔
کتنی ہی دیر تک وہ یوں ہی ساکت و جامد پڑے رہے۔ آخر نعیمہ دھڑکتے دل اور دبے قدموں سے اپنے بستر سے نیچے اُتری اور شارب کے کمرے کی طرف کھسکنے لگی۔ ابھی وہ درمیانے دروازے تک ہی پہنچ پائی تھی کہ اُسے شارب کی پھولی ہوئی سانسیں سنائی دیں۔ ایک دُوسرے کے دِل کی دھڑکنیں اور پھولی ہوئی سانسیں سن کر دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر ایک دُوسرے کو تھام لیا اور دروازے سے ذراہٹ کر ننگے فرش پر ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ دونوں کے ہونٹ سِلے ہوئے تھے۔ وہ باہر والوں کو اپنی موجودگی کا احساس نہیں دِلانا چاہتے تھے مگر دِل بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ مانو وہ کڑکتی دُھوپ میں منوں بوجھ اُٹھائے کسی پہاڑی پر چڑھے جا رہے ہوں۔
خوفناک سوچوں اور خیالوں میں گم سم کتنی ہی دیر تک وہ ساکت و جامد بیٹھے رہے۔ اَن گنت خیالوں میں نعیمہ کو اپنے بچوں کا خیال آیا۔
''شکر ہے آج ہمارے بچے یہاں نہیں ہیں۔ نہ جانے کس کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ کتنے ہی گھروں میں تو ہارٹ اٹیک کے واقعات رُونما ہو چکے ہیں اور آج یہاں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو جائے، کسی کو کوئی خبر نہیں ہوگی۔ ہم چاہے کتنا ہی چیخیں اور چلائیں، ہمارا کوئی بھی پڑوسی اپنی کھڑکی کا ایک پٹ بھی نہیں کھولے گا.........''
اب باہر خاموشی تھی۔ نہ کوئی آہٹ، نہ کھنکھناہٹ اور نہ ہی دستک۔ پچھلے کچھ عرصہ سے نعیمہ اِن معاملات میں خود کو شارب سے کچھ دلیر سمجھنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شارب کا خیال آتے ہی بستر سے اُٹھنے کی اُس میں ہمت پیدا ہوگئی تھی، تا کہ وہ شارب کے کمرے میں جا کر اُس کا اتہ پتہ معلوم کرے، کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہوگیا ہو۔ حالانکہ شروع شروع میں خود وہ کہیں دُور پار کی فائرنگ سے ہی خوفزدہ ہو کر بے ہوش ہو جایا کرتی تھی مگر اب شاید روز روز کے حادثات اور واقعات نے بہت سے اور لوگوں کی طرح اُسے بھی کچھ دلیری بخش دی تھی مگر شارب اب بھی بہت خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا

اور اِس سے پہلے کہ نعیمہ اُس کے پاس پہنچتی وہ محفوظ مقام کی تلاش میں خود اُسی کے کمرے کی طرف آرہا تھا اور اب وہ دونوں ایک دُوسرے کے سہارے فرش پر بیٹھے تھے۔ دل اگرچہ دونوں کے بے قابو ہوئے جارہے تھے مگر خود وہ کوئی سرگوشی تک کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہے تھے۔ بس وہ چپ تھے اور آنے والے خطرناک لمحات کے منتظر تھے۔ شارب کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر تک جب باہر سے کوئی آہٹ نہ سنائی دی تو نعیمہ نے شارب کو حوصلہ دینے کی غرض سے کہا۔

''وہ لوگ اب چلے گئے ہیں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔''

نعیمہ یہ تو بخوبی جانتی تھی کہ اگر سچ مچ کے وہی لوگ ہیں تو پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ دروازہ کھلوائے بغیر کہیں اور چلے جائیں مگر دِل کے خوش کرنے کو یہ خیال ہی کافی تھا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ جواب میں شارب نے تصدیق چاہی۔

''کیا واقعی وہ چلے گئے ہیں؟''

''ہاں! بالکل چلے گئے ہیں اور مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی ہمیں ڈرانے کی کوشش کررہا تھا۔ اگر سچ مچ وہی لوگ ہوتے تو اب تک دروازہ توڑ چکے ہوتے۔''

''ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' شارب نے بھی جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔ دونوں نے باتیں بھی سرگوشیوں میں کیں۔ شارب سوچوں ہی سوچوں میں خود کو کبھی بیلٹ فورس والوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا پاتا تو کبھی گولیوں اور دھماکوں کی زد میں آئے ہوئے اپنے مکان سے لاوے کی طرح اُٹھتے ہوئے دھوئیں کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا۔ نعیمہ نے دِل ہی دِل میں دونوں سربراہوں کو کوسا۔ ''کاش! تم لوگ اِس وقت ہماری حالت دیکھ لیتے۔ کاش تم یہ جان پاتے کہ ہم سالہا سال سے کس خوف اور دہشت سے دوچار ہیں اور آج خوف اور دہشت کے عالم میں بستر کے بجائے یوں ننگے فرش پر پڑے ہیں۔ نہ جانے آج ہماری صبح بھی ہوگی یا نہیں.......؟''

اپنی بے بسی پر نعیمہ کے آنسو نکل آئے۔ آنسو نکل چکے تو وہ اپنے اِس خیال پر پچھتا کر رہ گئی۔ ''آہ! یہاں تو ہزاروں مائیں ! اپنے جوان کڑیل بیٹوں کو کھو چکی ہیں۔ ہزاروں جوان عورتیں بیوگی کی آگ میں جھلس رہی ہیں اور میں کس بات کو لے کر رو پڑی ہوں۔ واجپئی اور مشرف! کاش، تم نے کسی ماں کو اپنے بیٹے کی لاش پر بین کرتے دیکھا ہوتا۔ کاش، تم نے کسی بیوہ کا ورلاپ سُنا ہوتا۔ تم ساری انا اور اکڑ بھول کر کسی فیصلے پر پہنچ جاتے۔ ہاں! مگر تم نے شاید یہی سُنا ہوگا کہ ماں نے بیٹے کی لاش دیکھ کر رونے کے بجائے کہا ''میرا اگر کوئی اور بیٹا ہوتا تو میں اُسے بھی اپنے دیش پر قربان ہونے کے لئے بھیج دیتی۔'' تم نے تو یہی سُنا ہوگا کہ بیوی نے شوہر کی لاش پر ورلاپ کرنے کے بجائے کہا ''مجھے فخر ہے کہ میرا شوہر دیش کے کام آیا۔'' ہاں کچھ باتیں صرف کہنے کی ہوتی ہیں......'' خوف و ہراس میں مبتلا نعیمہ اور شارب کو فرش پر بیٹھے ہوئے پانچ دس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ باہر اب بھی خاموشی تھی۔ اچانک نعیمہ کے ذہن میں ایک اہم خیال آیا۔ اُس نے جلدی سے شارب سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا ہوا ملاقات کا، سمجھوتہ ہوا......؟''

''نہیں! مشرف واپس چلا گیا۔'' شارب نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

''نہیں'' کا لفظ سُنتے ہی نعیمہ کے جسم سے رہی سہی جان بھی نکل گئی۔

''ہائے! اب کیا ہوگا؟'' بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا اور اُسی لمحے باہر سے ایک زوردار کھانسی کی آواز اُبھری۔ دونوں پھر سے لرز کر رہ گئے۔ دونوں کے دِل دھک دھک کرنے لگے۔ ''وہ کہیں نہیں گئے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟'' دونوں نے ایک دُوسرے سے پوچھا۔

شارب کے سارے جسم میں ایک عجیب سی سرسراہٹ ہوئی۔ پہلے ہاتھ پاؤں پھولے، پھر یخ ٹھنڈے ہوئے اور پھر اُس کا سارا جسم فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

○○○

چُوک

سر پر ہیٹ، آنکھوں پر سیاہ چشمہ، گھنی سیاہ مونچھیں، پُر کشش کلین شیو چہرہ، اُٹھی ہوئی گردن، دُور دُور تک جیسے کچھ تلاشتی ہوئی نظریں، ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ، گہرے نیلے رنگ کی جین کی پینٹ میں جکڑا ہوا موبائل اور ہاتھ میں یقینی طور پر چھوٹا سا کیمرا لئے، ایڑیاں جما جما کر قدرے تیز قدموں سے کچھ دُوری سے آتے ہوئے اُس نوجوان پر اُس کی جو نظر پڑی تو وہ فوراً ہی چوکس ہوگئی۔ ایک خوشی کی لہر اُس کے وجود کو سیراب کرگئی۔ اُسے یوں لگا جیسے آج اُس کی دیرینہ تلاش ختم ہوگئی ہو اور اُسے منزل مل گئی ہو۔

مگر اگلے ہی لمحے ایک خیال اُس کے وجود کو تھرا گیا۔ ''اللہ نہ کرے، یہ پُرکشش نوجوان کسی سے وابستہ ہو چکا ہو، یا پھر کیا معلوم کتنی ہی ناگنیں اِسے ہتھیانے کے لئے اِس کے پیچھے پڑی ہوں۔'' وہ دِل ہی دِل میں بڑ بڑا اُٹھی۔ ''مگر نہیں! حُلیے مہرے سے ایسا نہیں لگتا ہے۔'' اُس نے اپنے خیال کی خود ہی تردید کرڈالی۔

پہلی ہی نظر میں وہ اُس پر اِس قدر لٹو ہوگئی کہ خوبصورت لڑکیاں اُسے ایک دم سے ناگنیں سی لگنے لگی تھیں۔ ''خیر جو بھی ہو، وہ اُس کا اتہ پتہ معلوم کرے گی اور اُسے پانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔'' خود کو فوری طور پر ڈھارس بندھاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کا پیچھا کرنے کے لئے۔ ''وہ جہاں جہاں جائے گا، وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلی جائے گی۔ اُسے کسی نہ کسی بہانے سے مخاطب کرے گی۔ اُس کا اتہ پتہ معلوم کرے گی۔ وہ اُس کے ساتھ ڈھکا چھپا انداز ہرگز نہیں اپنائے گی بلکہ

سیدھے سیدھے اپنا مطلب اور مقصد اُس پر واضح کرے گی اور اسے اپنی غرض و غایت سے آگاہ کرے گی۔ چونکہ آج کے وقت کا تقاضا ہی یہی ہے کہ آدمی سیدھے سیدھے اپنے مطلب کی بات کرے۔ لمبی چوڑی تمہید باندھنے یا سننے کا بھلا کسی کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے اور پھر جو چیز بھا گئی سو بھا گئی۔ اِس میں گھماؤ پھراؤ یا بھاؤ تاؤ کہاں کا۔ اُسے تو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔'' وہ من ہی من میں باتیں کرتی رہی۔

زمین پر ایڑی جما کر چلتا ہوا سمارٹ سا نوجوان اُسے بے حد اچھا لگا تھا۔ دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُس کی سب سے زیادہ بھا جانے والی خوبی' اُس کا چھریرا بدن اور سیدھا نکلا ہوا مناسب قد تھا۔ اُسے چھوٹے قد کے مردوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بھلے ہی وہ شکل و صورت میں یا دیگر حیثیتوں سے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ اُس کا خیال تھا کہ ظاہری طور پر اچھے لگنے والے لوگ یقیناً باطنی طور پر بھی اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ اِسی لئے گزشتہ کچھ عرصہ سے وہ ایک ایسے ہی نوجوان کی تلاش میں تھی۔ وہ جہاں بھی جاتی' اُس کی نظریں کسی کو تلاشتی رہتی تھیں اور آج وہ مین چوک کے قریب ایک دُکان کے باہر لگی بنچ پر بیٹھی تین بجے کا اِنتظار کر رہی تھی۔ دیگر کام نپٹا کر اب اُسے ایل.آئی.سی کی قسط جمع کروانی باقی رہ گئی تھی اور ایل.آئی.سی کے دفتر میں کھانے کے وقفے کی وجہ سے اکثر کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ تین بجے تک ملازمین نے اپنی اپنی کرسیوں پر دوبارہ بیٹھنا تھا اور اُسے قسط جمع کروا کر گھر لوٹنا تھا۔ وہیں بنچ پر بیٹھے بیٹھے' سامنے کی سڑک پر آتے جاتے بے شمار لوگوں میں سے دُور سے آتا ہوا ایک نوجوان اُس کے من کو بھا گیا تھا اور اُس نے لمحوں میں ہی اُس کے بارے میں بہت کچھ سوچ بھی لیا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ نوجوان عین اُس کے سامنے سے گزرے گا اور وہ فوراً ہی کسی نہ کسی بہانے سے اُسے مخاطب کر لے گی۔ مثلاً یہی پوچھ لے گی کہ ایل.آئی.سی کے دفتر میں اِس وقت کرسیاں کیوں خالی پڑی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اُس نوجوان کا

رُخ مین چوک کے پیچھے سے گزرنے والی سڑک کی طرف تھا اور آگے دُور تک لمبے سے بازار کا سلسلہ تھا۔ وہ بھی فوری طور پر اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ جلدی جلدی چلنے لگی تا کہ اُس کے شانہ بہ شانہ چل کر اُسے قریب سے دیکھ سکے اور کوئی بات کر سکے۔ مگر دِقت یہ پیش آئی کہ بازار میں بہت ہجوم تھا۔ کندھے سے کندھا چھل رہا تھا اور وہ نوجوان آنکھوں سے اوجھل ہوا جا رہا تھا۔

وہ بڑی ہوشیاری سے کسی کو دھکیلتی ہوئی، کسی سے دھکا کھاتی ہوئی، ہجوم میں اپنا راستہ بناتی ہوئی چلتی جا رہی تھی۔ اُس وقت تو وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اُسے قسط جمع کروا کر بروقت گھر بھی پہنچنا ہے۔ آخر اُس نے دیکھا کہ نوجوان ایک دُکان میں داخل ہو گیا ہے۔ اُس نے بھی پیچھے پیچھے اُسی دُکان کا رُخ کیا۔

وہ بہت کم بازار میں نکلا کرتی تھی۔ ہجوم سے اُس کا دل گھبراتا تھا۔ بہت پہلے تک وہ خود ہجوم کا حصہ ہو جایا کرتی تھی مگر اب بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ہجوم اور رش سے اُسے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی اور وہ رش والی جگہوں پر جانے سے اِجتناب کرتی تھی مگر آج اُس پُرکشش نوجوان کا پیچھا کرتے ہوئے اُسے ہجوم میں ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایک فکر سی لگی تھی کہ وہ نوجوان اِس ہجوم میں کہیں آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے اور وہ اُسے ڈھونڈھتی ہی رہ جائے۔

بہت دُور تک بازار میں چلے جانے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ وہ ایک دُکان میں جا گھسا ہے تو وہ تیزی سے اُسی دُکان کی طرف لپکی۔ ابھی وہ دُکان کے عین سامنے پہنچی ہی تھی کہ اُس نے دیکھا، وہ دُکاندار سے کسی چیز کا پوچھ کر باہر نکل رہا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے باوجود ہشاش بشاش موڈ میں عین اُس کے راستے میں کھڑی ہو گئی اور بھرپور نظروں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اب وہ اُسے مخاطب کرنے ہی والی تھی کہ اُس کی نظریں اُس کے کھلے گریبان پر جا پڑیں اور اُس کی زبان گنگ ہو گئی اور دل دھک سے رہ گیا۔ البتہ دِل ہی دِل میں جو اُس نے کہا وہ کچھ یوں

تھا" درفٹ تیرے کی! سراپا دھوکا۔" اُس نے واپس پلٹنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ شکستگی، ناکامی، ندامت اور اُس سے بھی بڑھ کر اپنی بے وقوفی کے احساس کا عالم یہ تھا کہ اُسے ایل.آئی.سی کی قسط جمع کروانے کا خیال تک نہ آیا۔ اپنی بے وقوفی پر بیچ بیچ میں اُسے ہنسی بھی آتی رہی۔ آنکھوں کی کم ہوتی ہوئی بینائی پر بھی افسوس کرتی رہی مگر زیادہ لعنت ملامت وہ اُسی کی کرتی رہی۔ "بے وقوف! چُوک کر بیٹھا۔ خیر، کوئی نہ کوئی ثبوت باقی رہ ہی جاتا ہے۔ لاکھ جتن کے باوجود بھی۔ ورنہ کوئی چور، کوئی ڈاکو اور کوئی قاتل کبھی پکڑ میں نہیں آتا۔"

"اور اگر اُس نے سینہ بھی ڈائی کر لیا ہوتا تو!" اِس خیال سے اُس کی زبان دانتوں تلے آ گئی۔ "میں نے اُس پر اپنا مقصد واضح کیا ہوتا اور وہ اِس وقت مجھ پر ہنس رہا ہوتا اور میری نقل یوں اُتار رہا ہوتا۔ "سنو! میری ایک جواں سال خوبصورت لڑکی ہے۔ مجھے بالکل آپ جیسا سمارٹ سا داماد چاہیے۔ تم چاہو تو آج ہی میرے ساتھ چل کر لڑکی دیکھ سکتے ہو۔" گھر واپسی تک وہ اِسی طرح کی کئی دیگر سوچوں میں اُلجھی رہی۔

"پہلے وقتوں میں لوگ چالیس پچاس سال کی عمر میں دادا، دادی اور نانا، نانی بن کر اِنتقال بھی کر جایا کرتے تھے۔ ہمارے دادا جی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چالیس پینتالیس کی عمر میں تھے۔ چوتھی شادی کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ فوت ہو گئے۔ تاہم اُس وقت تک وہ نانا اور دادا بن چکے تھے۔ اب کے چالیس کی عمر میں بعض لوگ پہلی شادی کرتے ہیں اور پچاس ساٹھ سال تک جوان بنے رہتے ہیں۔ پہلے ملازمت میں آنے تک کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس سال تک تھی، اب کہ اڑتیس سال تک بڑھا دی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے اگر ریٹائرمنٹ کی عمر موجودہ مدّت سے کچھ زیادہ بڑھا دی جائے تو کچھ بُرا بھی نہیں ہے.........."

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچی۔ پرس بستر پر دے مارا اور جلدی سے کپڑے بدلنے لگی۔ کپڑے بدلتے بدلتے ہی وہ پکار اُٹھی۔ "نادیہ اری او نادیہ!

آج تو غضب ہوگیا میرے ساتھ۔" فکرمندسی نادیہ سامنے آ کھڑی ہوئی تو وہ بولی
"میں تمہارے اُوپر لگائی پابندی آج سے ختم کرتی ہوں۔ آج سے تم اپنی مرضی کی
مالک ہو۔ میری نظریں بوڑھی ہوگئی ہیں۔ اب تو مجھے اِن پر کوئی اعتبار نہیں رہا ہے اور تم
اپنی جوان نظروں سے اپنی پسند کا کوئی لڑکا چُن لو۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی
کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔"

نادیہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ گھر پہنچتے ہی ممی نے اُس کی شادی کی بابت باتیں
شروع کر دی ہیں اور برابر بولتی جا رہی ہیں۔ "نظریں، جو صدیوں کے فاصلے لمحوں میں
طے کرتی ہیں، دھوکا بھی کھا سکتی ہیں۔ بوڑھی نظریں تو یقیناً فریب کھاتی ہیں۔ اِس کا
مجھے آج تجربہ ہوا۔"

"ہوا کیا ممی؟" اپنی ممی کی سنجیدگی کو بھانپتے ہوئے نادیہ نے حیرت سے
پوچھا۔ تو وہ بولی۔ "ہوا یہ کہ آج بازار میں، میں تیرے لئے ایک بوڑھے پر لٹو ہوگئی۔
میں بھی کیا کرتی، وہ مُوا سر سے پاؤں تک خضاب زدہ تھا۔ اُوپر سے لباس بالکل جوان
لڑکوں کا سا۔ میں تو گھنٹہ بھر اُس کے تعاقب میں بھاگتی، دوڑتی رہی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ
کچھ بات کرنے سے پہلے ہی میری نظریں اُس کے سینے پر پڑ گئیں۔ رُوکھے، سفید اور
بے جان بالوں سے پتہ چلا کہ پچاس سے کم کا نہیں ہے۔ میں تو توبہ کرتی ہوئی بھاگ
کھڑی ہوئی......" نادیہ "ہنھ!" کہتے ہوئے پاؤں پٹخ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

OOO

بھوک سے نِڈھال بچوں کو ماں کی نیم جان لوری اچھی نہیں لگتی۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے ماں کو دیکھتے ہیں۔ ''یہ ماں کھانا کیوں نہیں دیتی ہے۔''

''کچھ بات ہے۔'' ایک دہشت سی دونوں معصوم بچوں پر طاری ہے مگر پیٹ روٹی مانگتا ہے۔ نیند بھوکے پیٹوں نہیں آتی ہے اور ماں لوریاں دے کر سُلا دینا چاہتی ہے۔ وہ سوتے میں بھی کہتے ہیں ''ماں! بھوک!''

خود اُن کی ماں کا پیٹ تو بھرا تھا' زخم کھا کھا کے۔ گزشتہ چار پانچ سالوں میں شاید ہی اُسے کبھی بھوک لگی ہو۔

''یہ بچے اگر بڑے ہوتے تو شاید ہی اُن کو بھوک لگتی۔'' اُس نے سوچا مگر ایسا سوچتے ہی وہ لرز گئی۔ ''نہیں! نہیں! تم بڑے نہیں ہونا۔ تم چھوٹے ہی رہنا۔ میں تمہیں اپنا خون پلاؤں گی۔ زِندہ رہنے کے لئے سب کچھ ہی تو کرنا پڑتا ہے۔ رحمٰن بڑا تھا' سلمان بڑا تھا مگر آج کہاں ہیں وہ! اِس طوفان میں بڑوں کا انجام بُرا ہے۔ تم بچے ہی رہو تا کہ ظالموں سے بچے رہو۔'' ''مگر کب تلک؟'' اِک نئی ہُوک سی اُس کے دِل میں اُٹھنے لگتی ہے۔ ''یہ طوفان تھمے گا؟ یہ قہر' یہ ہُو کا عالم' یہ خوف و ہراس' یہ وحشت! مگر کب تلک؟'' اچانک دونوں بچے ایک ساتھ پکارتے ہیں۔ ''ماں! بھوک!'' ایک ٹیس سی اُس کے دِل میں اُٹھتی ہے اور وہ سر پکڑ کے رہ جاتی ہے۔

بانو بیگم اپنے معصوم پوتوں کی حالت سے بے خبر نہیں ہیں۔ اصل قصوروار وہی تھیں۔ جب پڑوس والے گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو بانو بیگم اُنہیں بھی روک

رہی تھیں۔ ''مت جاؤ۔ اپنی جنت چھوڑ کر نہیں مت جاؤ۔''

''نہیں! اب یہاں جان کی امان نہیں ہے۔ ہم مجبور ہو کر اپنی جنت چھوڑ رہے ہیں۔ بانو بیگم! آپ بھی ہمارے ساتھ نکل پڑو۔ ہم جہاں جائیں گے ایک ساتھ رہ لیں گے۔'' مگر بانو بیگم نہیں مانی تھیں اور کہا تھا ''اپنی دھرتی پر ہم راجے ہیں۔ دھرتی چھوڑ دی تو ہم بھکاری کہلائیں گے اور پھر ہماری جان کو کیوں خطرہ ہونے لگا؟ ہم کوئی دہشت گرد تھوڑے ہی ہیں۔ بھلا کوئی ہمارا کیا بگاڑے گا۔ ہم کوئی بھول چوک نہیں کریں گے، کوئی ہمیں آکے گولی نہیں مارے گا۔ یہ دہشت گردی ختم ہو جائے گی۔ یہ کرفیو مہینوں تو نہیں لگیں گے۔ کرفیو لگانے والے بھی تو اِنسان ہیں۔ وہ اِنسان کی ضرورتوں سے غافل نہیں رہیں گے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر ہم یونہی در بدر ہو جائیں گے۔ لُٹ جائیں گے۔''

سب کو تو نہیں مگر ساتھ والے کندن لال جی کے گھرانے کو بانو بیگم نے سمجھا بجھا کر گھر بار چھوڑنے سے روک لیا تھا۔ ''ہم دُکھ درد بانٹ لیں گے۔''

بڑا سہارا تھا دونوں گھرانوں کو ایک دُوسرے کا۔ کرفیو کے دِنوں میں ایک دُوسرے کی ضرورتوں کو مل جُل کر پورا کر لیتے تھے۔ نیچے گلی میں اُترنا تو محال تھا۔ کرفیو تھا۔ فوجی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ موت منہ کھولے کھڑی تھی مگر چھتوں سے ہی تبادلہ ہو جایا کرتا تھا۔

اب بانو بیگم کو یوں لگنے لگا تھا کہ یہ کرفیو لگانے والے اِنسان نہیں کوئی اور ہی مخلوق ہیں۔ وہ جانماز پہ بیٹھی رو رو کر رحمٰن کی مغفرت کی دُعا کر رہی تھیں اور سلمان کی واپسی کی بھی۔ ''اے اللہ! تُو خوب جانتا ہے کہ میرا رحمٰن غدار اور مردود نہیں تھا۔ میرا سلمان آتنک وادی نہیں تھا...... اے مجاہدو! یہ کیسا جہاد ہے تمہارا۔ میرے گلشن میں تم نے یہ کیسی آگ بھڑکائی ہے۔ نقدی اور زیورات تم پستول کی نوک پر رکھوا لیتے لیکن رحمٰن تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا تھا اوروں کو لوٹنے کے لئے۔ وہ اپنی دھرتی پر اپنے ہی

لوگوں کا خون نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکا اور تم نے اُسے غدار اور مردود کہہ کر اُس کا خون اُس کے گھر میں بہا دیا۔ ایک ماں سے بیٹا چھین کر' ایک سہاگن کو بیوہ بنا کر دو معصوم بچوں کو یتیم بنا کر۔ تم نے بے گناہ رحمٰن کو غدار اور مردود کہہ کر مار دیا۔ تمہارا یہ جہاد تمہیں مبارک ہو۔''

''اُٹھ بانو بیگم اُٹھ! تیرا غم تنہا نہیں ہے۔ تیرے لُٹے گلشن کے یہ دو پھول کہیں مرجھا نہ جائیں۔'' بانو بیگم اپنے پوتے کے کراہنے کی آواز سن کر اپنے دُکھوں کو جھٹک کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھیں اور پڑوس والوں کو جھانکنے لگیں۔

''بچوں کے کھانے کو شاید کچھ مل ہی جائے۔''

''آہ! وہ چلے گئے آخر۔ اچھا کیا اُنہوں نے جو وہ چلے گئے۔'' اور خود بیگم اب چاہتے ہوئے بھی نہیں جا رہی تھیں۔ ''اب جانے اور لے جانے کو باقی کیا رہ گیا تھا۔ جس ماں نے اپنے جواں سال بیٹے کو خون میں لت پت تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا ہو' وہ اب اپنی جان لے کر کہیں اور چلی جائے.........نہیں! ہرگز نہیں۔''

پچھلی صبح کندن لال جی نے کہا تھا۔

''ہم نے یہاں سے نکلنے کا اِنتظام کر لیا ہے۔ یہ روز روز کے کرفیو! یہاں بھوکوں نہیں مرا جاتا۔ زندگی یہاں عذاب ہی عذاب ہے۔ گولیوں اور دھماکوں سے دل دہل گئے ہیں۔ بانو بیگم آپ بھی ہمارے ساتھ نکل پڑو۔''

''نہیں! اب جانے کو باقی کیا رہ گیا ہے۔ آپ چلے جایئے۔''

''وہ چلے گئے ہیں۔ اُن کے مقفل کواڑ کہہ رہے ہیں۔'' بانو بیگم نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ معصوم بچے بھوکے تھے اور کرفیو تھا۔ ''ہم دہشت گرد تھوڑے ہی ہیں۔ ہم کوئی بھول چوک نہیں کریں گے۔ کوئی ہمیں گھر میں آ کے گولی نہیں مارے گا۔'' بڑا ناز تھا بانو بیگم کو اپنی اِس سچائی پر۔ پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا؟

حفاظتی دستوں نے بے گناہ اور معصوم سلمان کو مار مار کر اپنا غصہ اُتارا تھا۔
اُن کی چوکی پر بم پھینکا گیا تھا اور پھر قرب و جوار کے رہنے والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سلمان بھی اُسی قیامت کا شکار ہوا تھا۔ آتنک وادی کہہ کر ظالموں نے اُسے دبوچ لیا تھا اور سیڑھیوں سے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔

''کبھی تو لوٹ آئے گا سلمان! وہ بے گناہ تھا۔ گولی کی آواز سن کر ماں کے سینے سے لپٹ جانے والا چودہ سالہ سلمان آتنک وادی نہیں تھا۔ وہ آئے گا......''

ہر دستک پر بانو بیگم لرز جاتی ہیں۔ ''کون آیا؟ رحمٰن؟ نہیں! آنکھوں کے سامنے دم توڑنے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ سلمان! نہیں......اوہ' یہ تو فوجی ہیں۔''

''ہمیں تلاشی لینی ہے۔''

''ہنھ! اِس لٹے ہوئے گھر کی تلاشی ہوتی رہے گی۔ مگر کب تلک؟''

''ہاں! ہاں! تلاشی لے لو۔ تم بھی تو کسی ماں کے رحمٰن اور سلمان ہو۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں! وہ اور ہیں۔ وہ جو سات دیواروں اور سات پردوں کے اندر رہتے ہیں۔ وہ ہم سے بہت دُور ہیں۔''

بانو بیگم کا دِل اب وہ دریا نہیں جس میں سیلاب آجائے بلکہ سمندر ہے' جو ہر وقت اندر ہی اندر موجزن رہتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ گھلنے والی بانو بیگم کے سِلے ہونٹوں پر بس ایک ہی سوال ہے۔

''کب تلک؟''

○○○

بلا عنوان

بہت کچھ سوچنے سمجھنے، بہت تحمل برتنے اور بہت دیر تک کڑھتے رہنے کے بعد آخر صائمہ نے بے بے کو واضح الفاظ میں وہاں سے چلے جانے کو کہہ ہی دیا۔ اِس سے قبل اِشاروں کنایوں میں وہ بے بے کو بہت کچھ سمجھا بجھا چکی تھی۔ مثلاً اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ دُوسروں کے گھر میں سو رُکاوٹیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ باہر کے بندے کی وجہ سے گھر والوں کے لئے بھی کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مگر بے بے بخوبی سمجھتی تھیں کہ ایسی باتوں کو سمجھ کر بھی نہ سمجھنے میں ہی اُن کی عافیت ہے۔ یوں بے بے، صائمہ کے لئے ایک مسئلہ بن گئی تھیں۔ اُدھر بے بے کے اپنے مسائل بھی کچھ کم نہ تھے۔ نہانا دھونا، کنگھی چوٹی کرنا، کپڑوں کی دُھلائی، صبح سویرے کی چائے، بعد دوپہر کی چائے، صاف ستھرا بستر، پُرسکون ماحول اور ڈھیر ساری پُرانے وقتوں کی باتیں اور یادیں۔ یہ سب کچھ صائمہ کے گھر کے علاوہ اور کہاں ممکن تھا۔

مگر اُس روز صائمہ نے اُنہیں صاف صاف اور واضح طور پر کہا۔

"دیکھو بے بے! میرے اور میرے گھر کے حالات ہی اب ایسے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا مہمان بھی میرے گھر آئے تو میں اُس کی دو دِن سے زیادہ خدمت نہیں کر سکتی ہوں۔ میں ملازم ہوں۔ میری ڈیوٹی سخت ہے اور پھر مجھے اپنے ذاتی کام بھی کرنے ہوتے ہیں اور سب سے بڑا اور اہم کام تو مجھے لکھائی پڑھائی کا ہے۔ میں اپنے دیگر بہت سارے کاموں کو چھوڑ کر یعنی کہ نقصان اُٹھا کر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں اور جب کوئی دُوسرا میرے ہاں موجود ہوتا ہے نا، تو میری لکھائی پڑھائی ڈسٹرب ہو جاتی

ہے۔ اِس لئے میں چاہتی ہوں کہ اب آپ اپنے گھر چلی جائیں۔''

بے بے نے کہا ''ابھی تو میں نے تمہارے ہاں ایک مہینہ اور رہنا ہے۔''

صائمہ کو بے بے سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اُس نے سوچا ''بے بے کے ساتھ اب ڈھٹائی سے پیش آنا ہوگا۔'' وہ جھٹ سے بولی ''نہیں! اب اور ایک مہینے کا بار میں نہیں اُٹھا سکتی۔ پہلے ہی میرا لکھنا پڑھنا ڈسٹرب ہو چکا ہے۔ آپ کا اپنا گھر تو ہے نا؟''

بے بے نے کہا ''وہاں مجھے میری مرضی کا کھانا نہیں ملتا ہے۔''

''مگر آپ کا ٹھکانہ تو ہے نا؟ آپ اپنا ٹھکانا مت چھوڑیئے۔ اپنے گھر سے اُٹھ کر جب آپ کسی دُوسرے کے گھر جائیں گی تو آپ کی کیا عزت رہے گی۔ آپ تینوں وقت میرے گھر آ کر کھایئے، چائے پیجیئے مگر یہ پوری طرح ڈیرہ ہی جما لینا! یہ بات کچھ جچتی نہیں ہے اور پھر مجھے اپنے گھر میں لگ بھگ اکیلے ہی رہنے کی عادت ہے۔ اب وقفے وقفے سے گیٹ کا کھلنا، کبھی بند ہونا، کبھی باتھ رُوم جانا، کبھی یہ کرنا، کبھی وہ کرنا، کبھی باتیں کرنا، بس مجھے ٹینشن ہو جاتی ہے اور میری پڑھائی لکھائی کا وقت ضائع ہوتا ہے۔''

بے بے ٹانگیں نیچے لٹکائے چار پائی پہ بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر وہ یوں ہی خاموش سی بیٹھی رہیں۔ پھر آہستہ سے اُنہوں نے ٹانگیں اُوپر سمیٹیں۔ ہاتھ بڑھا کر چار پائی پہ پڑا سرہانہ دُرست کیا اور لیٹ گئیں۔ صائمہ کو بے بے سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی۔ وہ ہکی بکی رہ گئی۔ اُس نے سوچا ''بڑھاپے میں آدمی شاید ڈھیٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ اب مجھے بھی ڈھٹائی سے ہی کام لینا ہوگا۔'' پھر اُس نے کہا ''بے بے! آپ رُخسانہ بی کے گھر رہیے۔ اُس کا گھر آپ کے گھر کے ساتھ ہی تو ہے اور پھر وہ آپ کی دیورانی بھی تو ہے۔'' بے بے نے فوراً سرہانے سے اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور کہا ''ارے تُو کون سی میری دُشمن ہے۔ تو بھی تو میری دیورانی ہی لگتی ہے نا۔ تمہارے گھر والے کا باپ میرا چاچا لگتا تھا۔'' صائمہ نے جواباً کہا ''وہ تو ٹھیک ہے مگر رُخسانہ بی کے ساتھ آپ نے زِندگی

گزاری ہے۔ اُس کے کتنے کام بھی کئے ہوں گے۔ وہاں آپ سُکھی رہیں گی۔"

"ارے نہیں! وہاں اُس کی بہو کے چھ سات بچے اِتنا شور کرتے ہیں اور اِتنا تنگ کرتے ہیں کہ مجھے وہاں سے دُوسرے ہی روز بھاگنا پڑتا ہے۔" بے بے نے جھٹ سے جواب دیا۔ تب صائمہ نے کہا "بے بے آپ شہناز کے ہاں رہ لیجئے۔ اُس کا گھر بھی آپ کے گھر کے پاس ہی ہے۔" بے بے جھٹ سے بولیں "ارے وہاں پہلے سے ہی ایک بڈھا لیٹا پڑا ہے۔ اب میں بھی وہیں چلی جاؤں! پچھلی بار اُس کے ہاں دو بار رہی تھی تو دونوں ہی بار اُس کی سیڑھیوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔"

صائمہ دل مسوس کر خاموش ہوگئی۔ اب وہ اور کیا کہتی۔ کچھ دیر تک بے بے بھی خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر چھڑی ہاتھ میں لی اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

صائمہ نے کہا "بے بے! ناراض مت ہونا۔ میں بھی مجبور ہوں۔ آپ کو چائے پانی کی جب بھی ضرورت پڑے، آکر کھا پی لینا۔"

بے بے نے 'ہاں' میں ذرا سا سر ہلایا۔ صائمہ کی نظر بے بے کے بکھرے بالوں پر پڑی۔ اُس نے سوچا "اور کون کرے گا بے بے کی کنگھی چوٹی۔" وہ جھٹ سے بولی "بے بے! ذرا دیر کو بیٹھو۔ میں آپ کی کنگھی چوٹی کرلوں۔" سر میں تیل لگا کر کنگھی چوٹی کر لینے کے بعد صائمہ نے بسکٹ کا ایک پیکٹ بے بے کو تھماتے ہوئے کہا "یہ جیب میں رکھ لو۔ بوڑھوں کو بچوں کی طرح بار بار بھوک جو لگتی ہے۔" بسکٹ کا پیکٹ کُرتے کی جیب میں ڈال کر بے بے اپنی اَدھ پرانی سی چپل میں پاؤں اُڑسنے لگیں۔

صائمہ نے دیکھا کہ بے بے کے پاؤں کے ناخن بڑھے ہوئے ہیں۔ اُس نے بے بے کے سامنے ایک کرسی رکھتے ہوئے کہا "بے بے! آپ چند منٹ کے لئے اِس کرسی پر ٹِک جایئے۔ صائمہ نے جھٹ سے گیس پر پانی گرم کیا اور اُن کے پیر دھوئے۔ چند روز قبل اُس نے بے بے کے ہاتھوں کے ناخن کاٹے تھے مگر پاؤں کے ناخن بڑے سخت تھے۔ اِس لئے اُس نے اُنہیں ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا مگر اب اِس خیال

سے کہ ''اور کون اُن کے ناخن کاٹے گا۔'' وہ اُن کے پاؤں کے ناخن کاٹنے بیٹھ گئی۔

یوں پوری تیاری کے ساتھ صائمہ نے بے بے کو کم وبیش ایک ماہ بعد اپنے گھر سے رُخصت کیا۔ اب وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بھنگڑا ڈالے۔ ایک ادھورا سا بھنگڑا اُس نے ڈالا بھی۔ پھر جھٹ سے باہری گیٹ بند کیا اور کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھ گئی۔ اُس نے ایک دُعا کی ''آج ایک اچھی سی تخلیق ہو جائے۔''

مگر باوجود کوشش کے اُس کا قلم چل نہیں رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اُسے شدید پچھتاوے نے آ گھیرا۔ ''میں نے بے بے کو اپنے گھر سے نکال کر شدید غلطی کی ہے۔ اُف! میں نے کتنی بے رُخی کی۔ کیسا ڈھیٹ پن اِختیار کیا اور بے بے کو گھر سے نکال کر ہی دم لیا۔ آج میرے ہاتھ پاؤں میں جان ہے تو یہ گھر، میرا گھر ہے۔ جس دِن جان باقی نہ رہی، میرا گھر بھی پرایا ہو جائے گا۔ بے بے کی طرح مجھے بھی دُوسروں کے گھر کا رُخ کرنا ہوگا۔ اپنے وقت میں بے بے کتنی معتبر اور سیانی شخصیت مانی جاتی تھیں۔ پاس پڑوس کی عورتیں اپنے مسائل لے کر اُن کے پاس جاتی تھیں۔ صلاح ومشورے کے لئے عزت واحترام سے اُنہیں اپنے گھر بلاتی تھیں مگر آج بے بے کو آتے دیکھ کر کچھ عورتیں اپنے گھر کے دروازے بند کر دیتی ہیں۔ وقت کی مار سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ بے بے آخر کتنا عرصہ میرے ہاں رہتیں! بلکہ دُنیا میں اور کتنی ہی دیر رہیں گی۔ گھر گھر رہ کر شاید اپنے حصے کا دانہ پانی سمیٹ رہی ہیں۔ نظر کمزور، جان کمزور، پھر بھی خیر برکت والی ہیں۔ اپنے قدموں چل پھر لیتی ہیں۔ اَسی سال کی عمر میں بھی.........'' یہی سوچتے سوچتے آدھا دِن گزر گیا۔ جس یکسوئی سے بیٹھ کر لکھنے کے لئے اُس نے بے بے کو گھر سے رخصت کیا تھا، نہ وہ یکسوئی تھی اور نہ ہی کچھ تخلیق ہو پا رہی تھی۔

چھٹی کا دِن تھا......وہ سوچنے لگی ''بے بے کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھ لیتی۔ بے بے گھر میں موجود تھیں تو بھی وہ خسارے میں، اب جا چکی ہیں تو بھی وہ خسارے میں ہے۔ اگر وہ تخلیق کار نہ ہوتی تو اِس وقت ذہنی ناآسودگی اور اذیت کا

شکار ہرگز نہ ہوتی بلکہ بے بے کی خدمت کر کے، اُس بے سہارا اور بے اولاد کا سہارا بن کر کم از کم اپنی عاقبت تو سنوار لیتی۔" وقت گزر رہا تھا۔ وہ سوچوں میں ڈوب اور اُبھر رہی تھی اور کچھ بھی لکھ نہیں پا رہی تھی۔

اُسے باہری جنگلے کے گیٹ کے کھلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ صائمہ کا ذہن سوچوں سے نکل کر اُسی طرف چلا گیا مگر دوبارہ آواز نہیں آئی۔ "شاید ہَوا سے ہلا ہوگا۔ اگر کوئی آیا ہوتا تو اب تک آواز دی ہوتی۔" کچھ ہی دیر بعد برآمدے میں بچھی چارپائی ذرا سی چرمرائی۔ جیسے کوئی اُس پر آ بیٹھا ہو۔ "کیا بے بے پھر سے واپس آ گئی ہیں؟" ایک خیال سا اُس کے ذہن میں کوندا۔ اِس خیال سے اُسے نہ خوشی ہوئی اور نہ ہی مایوسی۔ اِس کے بعد کوئی آہٹ نہیں ہوئی اور خاموشی چھائی رہی۔ قلم پھر بھی نہیں چل رہا تھا مگر وہ بیٹھی رہی۔ بیٹھے بیٹھے آخر تھک سی گئی۔ اِس لئے باہر کا چکر لگانے کا سوچ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے سے باہر نکلی، دالان سے گزر کر برآمدے میں پہنچی تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چارپائی پر بے بے، بے خبر سوئی پڑی تھیں۔ اب وہ ہنسے یا روئے! اُس نے جنگلے کا گیٹ زور سے کھولا مگر بے بے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ صائمہ نے آنگن میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک لاغر سی انگڑائی لی۔ پھر اندر کی طرف مڑ گئی۔ اب کے گیٹ کے کھلنے کی آواز آتے ہی بے بے پھڑک کر اُٹھ بیٹھیں۔

"اے تُو کون ہے؟ بولتا کیوں نہیں ہے۔ اکیلی لڑکی گھر میں دیکھ کر ہر کوئی دوڑ آتا ہے......" بے بے کے آخری جملے پر صائمہ کو رونا آ گیا۔

"بے بے کو کیسے کیسے خیال آ رہے ہیں۔ بے بے میرے گھر میں رہنے کے کیسے کیسے جواز ڈھونڈ رہی ہیں۔ گویا میری رکھوالی اور چوکیداری پر مامور ہوئی ہوں۔"

لیکن صائمہ نے جھٹ سے جواب دیا "میں ہوں بے بے! اب پوچھنا تو مجھے ہے کہ آپ پھر سے واپس آ گئیں..........؟"

○○○

اِنتقامی

سعید، میرا دوست، میری تمام تر ہمدردیوں اور کوششوں کے باوجود مجھے یوں رُسوا کردے گا، اِس کا اندازہ مجھے ہرگز نہیں تھا۔ یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ وہ اِنتقامی اور سخت مزاج کا آدمی ہے مگر وہ اپنے ذاتی فائدے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک معمولی سی بات کا بھی اِنتقام لے ڈالے گا، ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سعید کو جاننے والے سب ہی جانتے تھے کہ سعید اپنے عادات واطوار اور مزاج کے اعتبار سے عام لوگوں سے ہٹ کر ہے۔ آئے دِن کسی نہ کسی کے ساتھ اُس کا جھگڑا ہو جاتا۔ جھگڑے کی وجہ بے حد معمولی ہوتی مگر یہ سعید کا آتشیں مزاج تھا کہ معمولی سی بات کو بھی جھگڑے کا رُوپ دھارنے میں ذرا دیر نہ لگتی۔ سعید جہاں ہوتا وہاں بذاتِ خود وہ ایک مسئلہ ہوتا اور جہاں نہیں ہوتا، وہاں کِھلی اُڑانے کے انداز میں اُس کا ذِکر ضرور ہوتا۔

وہ کسی دیرینہ ناراضگی کے سبب اپنے گھر والوں سے الگ رہتا تھا مگر کسی نہ کسی بات کو لے کر آئے دِن گھر والوں کے ساتھ اُس کی جھڑپ ہو جاتی۔ وہ خود تو اِن جھڑپوں کا کسی سے ذِکر نہیں کرتا مگر نہ جانے کیسے اُس سے متعلق عجیب وغریب واقعات لوگوں تک پہنچ جاتے اور اُن کے لئے ہنسی مذاق کا سامان ہو جاتے۔

گھر سے متعلق اُس کا تازہ ترین واقعہ یہ تھا کہ اُس نے اپنے گھر والوں کے لئے ڈھیر سارا سامان خریدا مگر گھر والوں نے لینے سے اِنکار کرتے ہوئے اُسے کہا کہ تم تو اِس گھر کا پانی تک نہیں پیتے ہو اب تمہارا دیا ہم کیسے لے لیں؟ بس اُس نے آؤ دیکھا

نہ تاؤ۔ جھٹ سے سامان پر مٹی کا تیل ڈالا اور ہزاروں روپے کے سامان کو تیلی دِکھادی۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی بات پہلے ہی بول پر منوانا چاہتا تھا۔

اپنے اِدارے میں جہاں وہ سرکاری ڈیوٹی پر تعینات تھا' اپنی عجیب وغریب طبیعت کی بدولت ساتھیوں کے لئے دِل لگی کا سامان فراہم کرتا تھا۔

سعید کو بخوبی جاننے والے یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اُس کے بگڑے اور چڑچڑے مزاج کی وجہ صرف یہی ہے کہ اوائلِ عمر میں ہی شادی کرنے اور پھر بیوی کو طلاق دینے کے بعد چالیس سال تک کی عمر ہو جانے پر بھی اُس کا گھر آباد نہیں ہو سکا ہے۔ جی ہاں! بڑی وجہ تو یہی تھی مگر ایسے آدمی کا گھر کیسے بس سکتا ہے کہ جس کی پسند کا معیار ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بلند ہو اور ساتھ ہی ساتھ جس نے یہ شوشہ بھی چھوڑ رکھا ہو کہ وہ ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔

مگر اُسے قریب سے جاننے والے اِس حقیقت سے آگاہ تھے کہ سعید کچھ کڑی شرائط کے ساتھ شادی کا شدید خواہش مند ہے۔ مثلاً لڑکی سرکاری مُلازمت میں ہو' کم عمر ہو' قد سے لمبی ہو' حسین وجمیل ہو' جہیز کی اُسے قطعی ضرورت نہیں مگر لڑکی کا خاندان رئیس اور عزت دار ہو اور سب سے بڑی شرط یہ کہ لڑکی کے منہ میں زبان نہ ہو۔ اُس کی آخری شرط سے میں دِلی طور پر متفق تھا کیونکہ اُس کے ساتھ نبھنے نبھانے کے لئے لڑکی کا بے زبان ہونا ضروری تھا۔

جہاں تک خود اُس کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا تعلق تھا' تو وہ ہائی کوالیفائڈ تھا' سرکاری ملازمت میں تھا اور عنقریب ہی اُس کی پرموشن کے چانسز تھے۔ پہننے کے لئے اُس کے پاس تین عدد لباس تھے' کثرتِ اِستعمال سے جن کے رنگ اُڑے اُڑے سے تھے۔ تعلیمی ڈِگریوں اور روپے پیسے کی اُس کے پاس کمی نہیں تھی۔ گھر کے نام پر اُس کے پاس دُور پہاڑ کی چوٹی پر ایک کمرہ تھا جو خالی ڈِبوں' خالی بوتلوں اور خالی پیکٹوں سے اٹا پڑا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں اُس کی بان کی چارپائی بچھی تھی۔ درمیان

میں ایک بڑی میز رکھی تھی جس پر اُس کے کھانے پینے کے چند برتن ہمہ وقت دُھلے دُھلائے اوندھے منہ رکھے رہتے تھے۔

علاوہ ازیں پین سے لے کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسی قیمتی اشیاء توڑنے پھوڑنے، بحث و تکرار میں ہاتھا پائی پر اُترنے اور ڈگریوں کے بل بوتے پر ساتھیوں کے ساتھ لگائی گئی اکثر و بیشتر شرطیں ہارنے جیسے منفرد اور دلچسپ واقعات و حادثات بھی اُس کی ذاتِ گرامی سے وابستہ تھے اور اِن سب صلاحیتوں کے باوجود عرصۂ دراز سے اُس کا گھر غیر آباد تھا۔

اڑوس پڑوس کے کچھ نفسیاتی ماہرین کے خیال میں، اِس سے پہلے کہ سعید دیگر اشیاء کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دانت توڑنے اور سر پھوڑنے جیسی مہم کا آغاز کرے، اُس کا گھر بس جانا چاہیے۔ چنانچہ اِسی کوشش میں لگے رہنے پر آخر معلوم ہوا کہ فلاں علاقے میں فلاں جگہ کے ایک گھر میں ایک ملازم پیشہ لڑکی، کسی ملازم پیشہ شخص سے شادی کی خواہش میں زندگی کے پورے تیس سال گزار چکی ہے۔ بس پھر کیا تھا، پتہ پوچھتے ہوئے میں مطلوبہ لڑکی کے گھر تک جا پہنچا۔ معلوم ہوا کہ لڑکی بلاشبہ سرکاری ملازم ہے۔ گھر میں اور کوئی ملازم نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ اِس لئے عمر کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ دیگر کوئی عیب نہیں ہے اور اب جب کہ گھر میں خوشحالی ہے، لڑکی صرف ملازم پیشہ لڑکے سے شادی کی خواہش مند ہے۔ صرف یہ کہ لڑکا عمر میں لڑکی سے چند سال بڑا ہونا چاہیے اور شریف ہونا چاہیے۔ دیگر کوئی شرط نہیں ہے۔

شرافت کی بات سُن کر ضبط کرتے کرتے ہنسی میرے لبوں تک پہنچ ہی گئی۔ بہر حال، اِس خیال سے کہ شادی کے بعد اکثر مرد شریف شوہر ثابت ہوتے ہیں، میں نے اُنہیں سعید سے متعلق گواہی دی کہ لڑکا نہایت ہی شریف اور تابعدار ہے اور عمر میں بھی یقیناً بڑا ہے۔ اُنہوں نے اب تک شادی نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا

''لڑکا پہلے ڈِگریوں کے پیچھے رہا اور پھر ملازم پیشہ لڑکی کی تلاش میں مزید کئی سال ضائع ہو گئے۔''

غرض یہ کہ میں نے سعید سے متعلق اُنہیں بہتر سے بہتر معلومات فراہم کیں۔ اُنہوں نے یقین کر لیا اور لڑکا دیکھنے کی شدید خواہش ظاہر کی تا کہ لڑکا اور لڑکی ایک دُوسرے کو رُوبرو دیکھ کر ناپسند یا پسند کر لیں۔

لڑکی کے کوائف سعید کے سامنے رکھتے ہوئے میں نے کہا ''دیر آئد دُرست آئد کے مصداق تمہیں سرکاری ملازمت سے وابستہ ایک قبول صورت لڑکی مِل رہی ہے۔ اب دیر مت کرو۔ چلو اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر لو۔''

پہلے تو اُس نے میری باتوں کا یقین ہی نہیں کیا اور جب یقین کیا تو دعوے سے کہا ''لڑکی میں ضرور کوئی عیب ہوگا۔'' سعید کے اِس ریمارک پر مجھے بے حد غُصّہ آیا مگر میں اپنی دو دِن کی مسافت اور دیگر محنت کو یوں آسانی سے اور اِتنی جلدی ضائع نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اِس لئے اپنے غُصّے کو پیتے ہوئے کہا ''تم اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ پہلے ساری معلومات حاصل کرو۔ خود کو مطمئن کرو۔ پھر شادی کرو۔ لڑکی تمہارے پیچھے زبردستی نہیں آئے گی۔ محض شک کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کر لینا سراسر زیادتی ہے۔'' یوں بہت کچھ کہنے سُننے کے بعد سعید لڑکی دیکھنے کے لئے رضامند ہو گیا۔ میرے کہنے پر اُس نے نیا سوٹ سلوایا اور جانے کی تاریخ طے کی مگر عین وقت پر اُس نے ایک اور شرط رکھ دی ''اگر لڑکی نے مجھے ناپسند کیا تو......؟''

''تو پھر کیا......؟'' میں اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''تم خود کو کسی سے زبردستی پسند کرواؤ گے کیا؟ دیکھنے اور دِکھانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی کو پسند یا پھر ناپسند کیا جائے۔ جانے تم خود کو کیا سمجھ بیٹھے ہو؟''

وہ اپنے پیروں پر جم کر کھڑا ہو گیا اور دوٹوک الفاظ میں کہا ''نہیں! میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ بھلا میں وہاں جاؤں اور وہ لوگ مجھے دیکھنے کے بعد رِجیکٹ کر

دیں۔ اِس سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ لوگ خود یہاں آئیں اور مجھے دیکھیں۔ بھلے ہی رِجیکٹ کر جائیں۔''

سعید کا یہ اٹل فیصلہ سُن کو میری حالت دیدنی ہوگئی۔ جی چاہا کہ سعید کو اُس کے حال پر چھوڑ کر کہیں دُور بھاگ نکلوں مگر ضبط کیا اور سمجھانے کے سے انداز میں کہا ''دیکھو بھائی! تم کیسی اَنہونی سی باتیں کرتے ہو۔ لڑکی اور اُس کے گھر والے دوسو کلو میٹر دُور سے چل کر تمہیں دیکھنے کے لئے آئیں؟ کیا ہمارے ہاں ایسا پہلے کبھی ہوا ہے؟ آخر رسم ورواج کا بھی تو کچھ تقاضا ہے۔ ہمارے ماحول اور معاشرے میں ہمیشہ لڑکے والے لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں۔ میں لڑکی اور اُس کے گھر بار والے دیکھ آیا ہوں۔ وہ کوئی گھسے پِٹے لوگ نہیں ہیں جو تمہارے اور تمہاری ڈِگریوں کے پیچھے پیچھے دوڑے آئیں گے۔''

یوں پٹنے کے بعد اُس نے اپنی نئی شرط واپس لی اور لڑکی دیکھنے کے لئے اُس نے ایک ماہ بعد کی تاریخ مقرر کی مگر اسی بیچ لڑکی کے سرپرست کی طرف سے مجھے ایک پیغام ملا، جس میں اُنہوں نے کہا ''کچھ دیگر ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے دوست سعید نے پہلے بھی کوئی شادی کی تھی اور طلاق بھی دے چکے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ اُٹھائی جائے کیونکہ ہماری لڑکی کا کہنا ہے کہ مجھ میں کیا کمی ہے جو میں پہلے سے ایک شادی شدہ شخص کے ساتھ شادی کروں؟''

یہ سب سُن کر میں نے اُن صاحب سے تو کچھ نہیں کہا مگر دِل میں سوچا کہ یہ لڑکی یونہی تیس پینتیس کو نہیں پہنچی ہے۔ سعید کی طرح اُس کی پسند کا معیار بھی بہت ہی اُونچا ہے۔ اب بھی اگر یہی معیار برقرار رہا تو عمر بھر بن بیاہی ہی رہے گی۔

اب کہ میں اِس سوچ میں گھلنے لگا تھا کہ بات بے بات پر بگڑنے والے سعید کا سامنا کیسے کروں؟ اب اُس کے لئے کون سا بہانہ بناؤں؟ چند ہی روز بعد سعید ویل سوٹڈ بوٹڈ میرے گھر آن پہنچا اور کہا ''چلیئے! میں تیار ہوں نمائش کے لئے۔''

''لڑکا پہلے ڈِگریوں کے پیچھے رہا اور پھر ملازم پیشہ لڑکی کی تلاش میں مزید کئی سال ضائع ہوگئے۔''

غرض یہ کہ میں نے سعید سے متعلق اُنہیں بہتر سے بہتر معلومات فراہم کیں۔ اُنہوں نے یقین کرلیا اور لڑکا دیکھنے کی شدید خواہش ظاہر کی تاکہ لڑکا اور لڑکی ایک دُوسرے کو رُوبرو دیکھ کر نا پسند یا پسند کرلیں۔

لڑکی کے کوائف سعید کے سامنے رکھتے ہوئے میں نے کہا ''دیر آئد دُرست آئد کے مصداق تمہیں سرکاری ملازمت سے وابستہ ایک قبول صورت لڑکی مِل رہی ہے۔ اب دیر مت کرو۔ چلو اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرلو۔''

پہلے تو اُس نے میری باتوں کا یقین ہی نہیں کیا اور جب یقین کیا تو دعوے سے کہا ''لڑکی میں ضرور کوئی عیب ہوگا۔'' سعید کے اِس ریمارک پر مجھے بے حد غُصّہ آیا مگر میں اپنی دو دِن کی مسافت اور دیگر محنت کو یوں آسانی سے اور اِتنی جلدی ضائع نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اِس لئے اپنے غُصّے کو پیتے ہوئے کہا ''تم اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ پہلے ساری معلومات حاصل کرو۔ خود کو مطمئن کرو۔ پھر شادی کرو۔ لڑکی تمہارے پیچھے زبردستی نہیں آئے گی۔ محض شک کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرلینا سراسر زیادتی ہے۔'' یوں بہت کچھ کہنے سُننے کے بعد سعید لڑکی دیکھنے کے لئے رضامند ہوگیا۔ میرے کہنے پر اُس نے نیا سوٹ سلوایا اور جانے کی تاریخ طے کی مگر عین وقت پر اُس نے ایک اور شرط رکھ دی ''اگر لڑکی نے مجھے ناپسند کیا تو........؟''

''تو پھر کیا......؟'' میں اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''تم خود کو کسی سے زبردستی پسند کرواؤ گے کیا؟ دیکھنے اور دِکھانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی کو پسند یا پھر ناپسند کیا جائے۔ جانے تم خود کو کیا سمجھے بیٹھے ہو؟''

وہ اپنے پیروں پر جم کر کھڑا ہوگیا اور دوٹوک الفاظ میں کہا ''نہیں! میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ بھلا میں وہاں جاؤں اور وہ لوگ مجھے دیکھنے کے بعد رِجیکٹ کر

دیں۔ اِس سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ لوگ خود یہاں آئیں اور مجھے دیکھیں۔ بھلے ہی رِجیکٹ کر جائیں۔"

سعید کا یہ اٹل فیصلہ سُن کو میری حالت دیدنی ہوگئی۔ جی چاہا کہ سعید کو اُس کے حال پر چھوڑ کر کہیں دُور بھاگ نکلوں مگر ضبط کیا اور سمجھانے کے سے انداز میں کہا "دیکھو بھائی! تم کیسی اَنہونی سی باتیں کرتے ہو۔لڑکی اور اُس کے گھر والے دو سو کلو میٹر دُور سے چل کر تمہیں دیکھنے کے لئے آئیں؟ کیا ہمارے ہاں ایسا پہلے کبھی ہوا ہے؟ آخر رسم ورواج کا بھی تو کچھ تقاضا ہے۔ ہمارے ماحول اور معاشرے میں ہمیشہ لڑکے والے لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں۔ میں لڑکی اور اُس کے گھر بار والے دیکھ آیا ہوں۔ وہ کوئی گھسے پِٹے لوگ نہیں ہیں جو تمہارے اور تمہاری ڈِگریوں کے پیچھے پیچھے دوڑے آئیں گے۔"

یوں پلٹنے کے بعد اُس نے اپنی نئی شرط واپس لی اور لڑکی دیکھنے کے لئے اُس نے ایک ماہ بعد کی تاریخ مقرر کی مگر اِسی بیچ لڑکی کے سرپرست کی طرف سے مجھے ایک پیغام ملا، جس میں اُنہوں نے کہا "کچھ دیگر ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے دوست سعید نے پہلے بھی کوئی شادی کی تھی اور طلاق بھی دے چکے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ اُٹھائی جائے کیونکہ ہماری لڑکی کا کہنا ہے کہ مجھ میں کیا کمی ہے جو میں پہلے سے ایک شادی شدہ شخص کے ساتھ شادی کروں؟"

یہ سب سُن کر میں نے اُن صاحب سے تو کچھ نہیں کہا مگر دِل میں سوچا کہ یہ لڑکی یونہی تیس پینتیس کو نہیں پہنچی ہے۔ سعید کی طرح اُس کی پسند کا معیار بھی بہت ہی اُونچا ہے۔ اب بھی اگر یہی معیار برقرار رہا تو عمر بھر بن بیاہی ہی رہے گی۔

اب کہ میں اِس سوچ میں گھُلنے لگا تھا کہ بات بے بات پر بگڑنے والے سعید کا سامنا کیسے کروں؟ اب اُس کے لئے کون سا بہانہ بناؤں؟ چند ہی روز بعد سعید ویل سوٹڈ بوٹِڈ میرے گھر آن پہنچا اور کہا "چلئے! میں تیار ہوں نمائش کے لئے۔"

مگر میرا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں سعید کو دیکھ کر بیٹھے سے لیٹ گیا۔ میں کہیں بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آخر حقیقت بتانی ہی پڑی۔ میں نے ہمت جُٹا کر کہا ''یار سعید! اُن لوگوں نے ہمیں آنے سے منع کیا ہے۔ اُنہیں پتہ چلا ہے کہ تم نے پہلے بھی کوئی شادی کی تھی اور وہ لڑکی کہتی ہے کہ مجھ میں کیا کمی ہے جو میں پہلے سے ایک شادی شدہ شخص کے ساتھ شادی کروں؟''

سعید بھڑک اُٹھا۔ مانو پٹرول کو آگ نے چھولیا ہو۔ ''ہاں! میں نے پہلے شادی کی تھی۔ چوری نہیں کی تھی۔ میں تُف بھیجتا ہوں ایسی لڑکیوں پر۔ میں خاک ڈالتا ہوں ایسی لڑکیوں کے سر پر۔'' سعید کتنی ہی دیر بکتا رہا اور میں چُپ چاپ سُنتا رہا جیسے کہ اصل مجرم میں ہی ہوں۔

بھڑاس نکالنے کے بعد سعید گھر چلا گیا۔ میں نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ میں چکّی کے اِن دو پاٹوں میں پسنے سے بال بال بچ گیا مگر ابھی دو ماہ ہی گزرے تھے کہ لڑکی والوں کی طرف سے پھر پیغام آیا'' کچھ سمجھانے بجھانے کے بعد اب ہماری لڑکی مان گئی ہے۔ آپ سعید کو لے کر جلد سے جلد پہنچئے۔''

میں نے چُپ سادھ لی۔ کچھ دِنوں بعد پھر پیغام آیا'' آپ کب آرہے ہیں؟ ہم شدّت سے اِنتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے جواب میں ٹال مٹول کرنا شروع کر دیا۔ ''ابھی سعید سے رابطہ نہیں ہوا ہے۔ کچھ ہی دِنوں بعد آپ کو خبر بھیجیں گے' وغیرہ وغیرہ۔'' مگر ایک کے بعد ایک پیغام آنے لگے۔ ''آیئے' آیئے۔ ایک بار تو آکر دیکھ لیجئے۔ دیکھنے تو دیجئے۔ ہم کب تک اِنتظار کریں......؟''

یوں بار بار لڑکی والوں کی طرف سے گزارش کرنے پر میرا نرم دِل لڑکی والوں کی بے بسی اور مجبوری دیکھ کر بے چین ہو اُٹھا۔ ''میری بدولت اگر ایک ضرورت مند لڑکی کا گھر بس جائے تو یہ میرے لئے کارِ خیر ہوگا......'' میں سوچنے لگا۔ اُس بڑی عمر کی لڑکی کی سہمی سہمی صورت میری نظروں میں بار بار آنے لگی۔ پہلے تو میں سعید کی

خاطر میدان میں کود پڑا تھا مگر اب میری تمام تر ہمدردیاں لڑکی کے لئے تھیں۔

ایک بار پھر سے میں سعید کے دربار میں گزارش لئے' ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میری بات سُنتے ہی سعید جھٹ سے بولا ''ہاں! کوئی اور نہیں ناملا۔ اب پھر سے مجھ پر ڈورے ڈالنے لگے ہیں۔''

میں نے کہا ''تو تمہیں کون سی ہیر مل گئی ہے دوست! تم بھی تو اب تک یونہی پھر رہے ہو نا؟'' میں اُسے طرح طرح سے دلیلیں دیتا رہا اور مناتا رہا مگر وہ برابر اِنکار کرتا رہا۔ ''اب تو میں ایسے لوگوں کے ہاں ہرگز نہیں جاؤں گا اور کبھی نہیں جاؤں گا۔'' مگر مکرتے مکرتے اچانک ہی اُس نے کہا ''اچھا! کوئی بات نہیں۔ چل پڑتے ہیں۔ دیکھنے دِکھانے میں حرج ہی کیا ہے۔''

سعید کے اِس اچانک پلٹے پر میں نے اُس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ میں خوش ہوا کہ آخر میں کسی کے کام آ ہی گیا۔

اپنے آنے کی پیشگی اِطلاع دینے کے بعد جب ہم دونوں دوست لڑکی والوں کے ہاں پہنچے تو گھر والوں کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ مانو اُن کے گھر برات آن پہنچی ہو۔ اُنہوں نے ہمارے لئے پُر تکلف کھانے کا اہتمام کیا۔ لڑکی سمیت سب گھر والوں نے ہمارے ساتھ خورد و نوش کیا۔ زیادہ عمر کے احساس تلے دبی لڑکی کے چہرے پر دُلہن کا سا نِکھار اُبھر آیا تھا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ جان پہچان ہوتی رہی۔ اِسی بیچ سعید خوب ہنستا اور ہنساتا رہا۔ باتوں کے جواب میں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے کہتا رہا۔ آخر میں لڑکی کے سرپرست نے کہا ''آپ ہماری پسند اور معیار کی کسوٹی پر کھرے اُترے ہیں۔ اگر ہم بھی آپ کے معیار پر پورے اُتر رہے ہوں تو اپنے فیصلے سے ہمیں بھی آگاہ کردیجئے گا۔'' اُسی لمحے سعید نے میرے گھٹنے کو اپنی کہنی سے ذرا سا دبا دیا جس کا واضح مطلب سمجھنے سے میں قاصر ہی رہا۔

آخر بہت جلد واپس آنے کی بات کہہ کر سعید اور میں نے اُن سے اِجازت

طلب کی اور اپنے گھر کی راہ لی۔ راستے بھر میں سعید کے سامنے اُن لوگوں کی تعریفیں کرتا رہا۔ ''سعید یار! دیکھو تو اُن لوگوں نے ہماری کتنی آؤ بھگت کی۔ جیسے کہ ہم برسوں سے اُن کے شناسا رہے ہوں اور دیکھو جتنی دیر ہم وہاں رہے' گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ہماری دِل جوئی کے لئے ہمارے پاس بیٹھا ہی رہا۔'' مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ سعید نے اگر اِنکار کر دیا تو اُس سہمی سہمی لڑکی کے دِل پر کیا گزرے گی۔

گھر پہنچ کر میں نے سعید سے کہا ''بھئی تمہیں لڑکی دِکھانی تھی' وہ دِکھلا دی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں چلتا ہوں اب۔'' سعید نے کہا ''ابھی ایک کام اور بھی کر دیجئے گا۔ بس اُنہیں میرے فیصلے سے آگاہ کر دیجئے گا۔''

''تو کیا ہے تمہارا فیصلہ؟'' میں نے کچھ چونکتے ہوئے پوچھا۔

''اب کے اگر اُن کا کوئی پیغام آئے' تو اُنہیں میری طرف سے اِنکار کہہ دیجئے گا۔'' سعید نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

''مگر کیوں؟ کیوں؟'' سعید کا یہ فیصلہ مجھے جھنجلا دینے کے لئے کافی تھا۔ سعید نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''کیونکہ اِسی لڑکی نے مجھے پہلے سے شادی شدہ ہونے پر ناپسند کیا تھا۔ بس اور کچھ نہیں۔''

''اور بس! بس اِتنی سی بات کے لئے تم ایک سنہری چانس چھوڑ رہے ہو۔ ایک مجبور لڑکی کا دِل توڑ رہے ہو۔ اب تمہاری سزا یہی ہے کہ تم بِن بیاہے رہو۔ آئے دِن لوگوں کے ساتھ تمہاری چپقلش ہوتی رہے اور تم چڑ چڑ کرتے رہو......''

ooo

خیرات

بڑی میڈم صاحبہ اور اُن کی ساتھی میڈ میں، اپنے آفس کے برآمدے میں کُرسیوں پر بیٹھیں، اپنے کسی آئندہ پروگرام کے بارے میں محوِ گفتگو تھیں اور وقفے وقفے سے اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دُوسرے سے ہنسی مذاق بھی کر رہی تھیں۔

بڑی میڈم صاحبہ اپنے سر پر سیاہ سکارف اوڑھے، ایک بڑی کرسی پر، جس کے سامنے ایک ٹیبل لگا تھا، بیٹھی تھیں، جبکہ اُن کی ساتھی میڈ میں سامنے لگی دیگر کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ محفل نہایت ہی خوشگوار ماحول میں جمی تھی۔ اِسی دوران ایک دُبلی پتلی سی عورت، پُرانی اور میلی سی ساڑھی پہنے، بغل میں ایک کمزور اور مریل سا بچہ اُٹھائے ہوئے اُن کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور ہاتھ پھیلا کر کہا "بہن جی! بھگوان کے نام پر کچھ دے دو، ہم بھوکے ہیں، ہمارا بچہ بھوکا ہے.........."

چند میڈموں نے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ اپنے اپنے بیگوں اور پَرسوں کی طرف بڑھا دیئے لیکن بڑی میڈم مانگنے والی سے برہم سے لہجے میں بولیں "کیوں مانگتی ہو؟ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں نا تمہارے؟ کام کرو کام! مانگنے کی تم لوگوں کو عادت سی پڑ گئی ہے۔ جہاں دیکھو تم لوگ حاضر ہوتے ہو۔ بس منہ اُٹھائے چلی آتی ہو مانگنے۔" یہ کہہ کر بڑی میڈم نے اپنی ساتھی میڈموں سے کہا "بھئی! مت دو اِسے۔ یہ لوگ مانگ کر شراب پیتے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو، پُل کے آر پار یہ لوگ کیسے بے سُدھ پڑے ہوتے ہیں؟"

بڑی میڈیم کے حکم کی تعمیل میں بیگ و پرس کھولنے والیوں نے اپنے ہاتھ

طلب کی اور اپنے گھر کی راہ لی۔ راستے بھر میں سعید کے سامنے اُن لوگوں کی تعریفیں کرتا رہا۔ ''سعید یار! دیکھو تو اُن لوگوں نے ہماری کتنی آؤ بھگت کی۔ جیسے کہ ہم برسوں سے اُن کے شناسا رہے ہوں اور دیکھو جتنی دیر ہم وہاں رہے' گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ہماری دِل جوئی کے لئے ہمارے پاس بیٹھا ہی رہا۔'' مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ سعید نے اگر اِنکار کر دیا تو اُس سہمی سہمی لڑکی کے دِل پر کیا گزرے گی۔

گھر پہنچ کر میں نے سعید سے کہا'' بھئی تمہیں لڑکی دِکھانی تھی' وہ دِکھلا دی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں چلتا ہوں اب۔'' سعید نے کہا'' ابھی ایک کام اور بھی کر دیجئے گا۔ بس اُنہیں میرے فیصلے سے آگاہ کر دیجئے گا۔''

''تو کیا ہے تمہارا فیصلہ؟'' میں نے کچھ چونکتے ہوئے پوچھا۔

''اب کے اگر اُن کا کوئی پیغام آئے' تو اُنہیں میری طرف سے اِنکار کہہ دیجئے گا۔'' سعید نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

''مگر کیوں؟ کیوں؟'' سعید کا یہ فیصلہ مجھے جھنجلا دینے کے لئے کافی تھا۔ سعید نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا'' کیونکہ اِسی لڑکی نے مجھے پہلے سے شادی شدہ ہونے پر ناپسند کیا تھا۔ بس اور کچھ نہیں۔''

''اور بس! بس اِتنی سی بات کے لئے تم ایک سنہری چانس چھوڑ رہے ہو۔ ایک مجبور لڑکی کا دِل توڑ رہے ہو۔ اب تمہاری سزا یہی ہے کہ تم بِن بیاہے رہو۔ آئے دِن لوگوں کے ساتھ تمہاری چپقلش ہوتی رہے اور تم چڑ چڑ کرتے رہو......''

○○○

بڑی میڈم صاحبہ اور اُن کی ساتھی میڈ میں' اپنے آفس کے برآمدے میں کُرسیوں پر بیٹھیں' اپنے کسی آئندہ پروگرام کے بارے میں محوِ گفتگو تھیں اور وقفے وقفے سے اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دُوسرے سے ہنسی مذاق بھی کر رہی تھیں۔

بڑی میڈم صاحبہ اپنے سر پر سیاہ سکارف اوڑھے' ایک بڑی کرسی پر' جس کے سامنے ایک ٹیبل لگا تھا' بیٹھی تھیں' جبکہ اُن کی ساتھی میڈ میں سامنے لگی دیگر کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ محفل نہایت ہی خوشگوار ماحول میں جمی تھی۔ اِسی دوران ایک دُبلی پتلی سی عورت' پُرانی اور میلی سی ساڑھی پہنے' بغل میں ایک کمزور اور مریل سا بچہ اُٹھائے ہوئے اُن کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور ہاتھ پھیلا کر کہا ''بہن جی! بھگوان کے نام پر کچھ دے دو' ہم بھوکے ہیں' ہمارا بچہ بھوکا ہے..........''

چند میڈموں نے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ اپنے اپنے بیگوں اور پَرسوں کی طرف بڑھا دیئے لیکن بڑی میڈم مانگنے والی سے برہم سے لہجے میں بولیں ''کیوں مانگتی ہو؟ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں نا تمہارے؟ کام کرو کام! مانگنے کی تم لوگوں کو عادت سی پڑ گئی ہے۔ جہاں دیکھو تم لوگ حاضر ہوتے ہو۔ بس منہ اُٹھائے چلی آتی ہو مانگنے۔'' یہ کہہ کر بڑی میڈم نے اپنی ساتھی میڈموں سے کہا ''بھئی! مت دو اِسے۔ یہ لوگ مانگ کر شراب پیتے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو' پُل کے آر پار یہ لوگ کیسے بے سُدھ پڑے ہوتے ہیں؟''

بڑی میڈیم کے حکم کی تعمیل میں بیگ و پرس کھولنے والیوں نے اپنے ہاتھ

روک لئے اور مانگنے والی خالی ہاتھ لوٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور مانگنے والا آن پہنچا۔ اب اِن مانگنے والوں کو کون روکے؟ وہ ہسپتالوں، اسکولوں، کالجوں، دفتروں اور دیگر اِداروں میں بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر اُن کے لئے آسانی یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی جگہ سے اُنہیں کچھ زیادہ پیسے مل جاتے ہیں اور وہ زیادہ بھاگ دوڑ کرنے سے بچ جاتے ہیں۔

اِس بار مانگنے والا ایک ادھیڑ عمر سِکھ تھا، جو دُھلے ہوئے مگر ادھ پُرانے سے کپڑے اور بے رنگ سی پگڑی پہنے ہوئے تھا۔ میڈموں کے عین سامنے کھڑے ہو کر اُس نے کہنا شروع کیا "میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی اور نہ ہی میرے خاندان میں کبھی کسی نے بھیک مانگی ہے۔ آگ کی ایک واردات میں میرا گھر اور سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ میں آپ سے صرف ایک بار کی مدد چاہتا ہوں۔"

پہلے کی طرح کچھ میڈموں نے اپنے ہاتھ اپنے بیگوں کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ بڑی میڈم مانگنے والے سے نہایت ہی سخت لہجے میں بولیں "ہاں ہاں! بہانوں کی کوئی کمی ہے کیا؟ مانگنے والوں کو مانگنے کے سو بہانے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی کے لئے سیلاب آجاتا ہے اور اُس کا سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ تمہارے لئے آگ بھڑک اُٹھی۔ تمہارا سب کچھ راکھ ہو گیا اور تم بچ گئے مانگنے کے لئے۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں نا، جاؤ کہیں کام کرو.........."

میڈم جی کا آخری جملہ ابھی مکمل ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ آدمی نظریں جُھکا کر واپس بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کی تیز رفتاری سے لگتا تھا کہ اب وہ کبھی کسی سے کوئی مدد طلب نہیں کرے گا۔ بڑی میڈم نے اپنے سٹاف کی میڈموں کے ساتھ میٹنگ سے متعلق باتیں جاری رکھیں اور اب جب اُن کی میٹنگ برخاست ہونے ہی والی تھی کہ اُن کی نظریں دو عورتوں پر جا ٹھہریں۔ دونوں عورتیں مین گیٹ سے اندر داخل ہو کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی سیدھی اُوپر والے برآمدے میں چلی گئیں، جہاں کچھ مرد لوگ

بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں عورتیں بُرقع پوش تھیں' اگرچہ اُن کے چہرے کُھلے ہوئے تھے۔ ایک عورت جوان تھی' جبکہ دُوسری ادھیڑ عمر کی تھی۔ جوان عورت کے ہاتھ میں ایک لمبا سا کاغذ لہرا رہا تھا۔

میٹنگ میں بیٹھی ہوئی میڈموں نے اپنے اپنے بیگ سنبھالتے ہوئے بڑی میڈم سے پوچھا "اب ہم چلیں نا........؟"

"ایک منٹ کے لئے ٹھہرو۔ ذرا پتہ لگنے دو کہ یہ عورتیں کون ہیں اور کیا کہتی ہیں؟" بڑی میڈم صاحبہ نے جواب دیتے ہوئے سبھی کو روک دیا۔

اگلے چند ہی منٹوں میں وہ دونوں عورتیں اپنے میلے کچیلے برقعے لہراتی ہوئیں میڈموں کے سامنے آ پہنچیں اور ہاتھ میں لیا ہوا لمبا سا کاغذ آگے کی طرف بڑھاتی ہوئی جوان عورت گویا ہوئی "میڈم جی' یہ تصویر ہماری بڑی بہن کی ہے۔ اِس کے چھوٹے چھوٹے چھ بچے ہیں۔ یہ پہاڑی سے نیچے گری اور اِس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہم ہسپتال لے گئے' ڈاکٹروں نے ٹانگ کاٹ ڈالی۔ اِس کا خون ختم ہوگیا۔ اب پیسے نہیں ہیں' علاج کیسے کروائیں؟ دوائی مہنگی ہے' ڈاکٹر کی فیس بہت ہے۔ میڈم جی ہماری مدد کرو........" ساتھ والی ادھیڑ عمر عورت اُس کی باتوں کی تائید کرتی گئی۔

بڑی میڈم نے فوراً کاغذ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اُسے اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھنے لگیں۔ اُس کاغذ پر ایک رنگین تصویر چسپاں تھی۔ نیچے کچھ لکھا تھا اور سٹیمپ بھی لگی تھی۔ میڈم صاحبہ نے پڑھا تو کچھ نہیں' البتہ تصویر کو غور سے دیکھا۔ تصویر میں ایک جوان عورت رانوں پر ہاتھ رکھے پُرسکون انداز میں بیٹھی سامنے تک رہی تھی۔ اُس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے کچھ اُوپر سے کٹی ہوئی تھی اور اُس پر تازہ تازہ خون دِکھائی دے رہا تھا۔

بڑی میڈم نے اُس تصویر کو خود دیکھ لینے کے بعد اپنی ساتھی میڈموں کی طرف بڑھا دیا اور جلدی سے اپنا پرس کھولتے ہوئے باقی میڈموں سے کہا "بھئی دے

دو اِنہیں جتنا بھی ہوسکتا ہے، بے چاری مصیبت میں پڑی ہیں.........!'' آہ بھر کر آخری جملہ پورا کرتے ہوئے بڑی میڈم نے اپنے پرس سے سو روپے کا نوٹ نکال کر داہنے ہاتھ کی دو اُنگلیوں میں تھام لیا۔

باقی سبھی میڈموں نے باری باری تصویر کو دیکھا اور سر اُٹھا اُٹھا کر سامنے کھڑی دونوں عورتوں کو دیکھا اور پھر اپنے اپنے بیگ و پرس کھولنے اور ٹٹولنے لگیں۔ بڑی میڈم نے اپنی ساتھی میڈموں سے کہا۔

''ایسے کوئی تھوڑی ہی مانگتا ہے! مر کے مانگا جاتا ہے، مر مر کے.........''

اب کہ کسی میڈم نے گِن گِن کر سو روپے پورے کئے، کسی نے اسّی روپے گِنے، کسی نے ساٹھ اور کسی نے پچاس نکالے۔

ادھیڑ عمر عورت نے جھولی آگے پھیلائی اور میڈموں نے روپے اُس کی جھولی میں ڈال دئے۔ بڑی میڈم نے آخر میں اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں میں تھامے ہوئے سو کے نوٹ سے ہی اِشارہ کر کے عورت کو اپنے قریب بُلایا اور سو کا نوٹ اُس کی جھولی میں ڈال کر پچاس کا نوٹ اُٹھالیا۔

وہ دونوں عورتیں خوشی خوشی اپنی اگلی منزل کی جانب چل پڑی تھیں۔

OOO

مت پوچھئے

حضرات! مت پوچھئے، ہم پہ کیا گزری جب اپنے ہاتھوں پٹخا ہوا کھانا پھر سے اُٹھا کر ہمیں کھانا پڑا۔

کچھ باتیں کہنے کی نہیں ہوتی ہیں مگر دِل پر بوجھ ہوتی ہیں اور جنہیں کہے بغیر غم ہلکا نہیں ہوتا اور دُوسروں کا بھی بھلا نہیں ہوتا۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ غم ہلکا کرنے کے لئے بات کا آغاز کہاں سے کریں۔ پٹخے ہوئے کھانے کے حوالے سے یا پچیس سال پہلے ہونے والی اپنی شادی اور پھر آئے دِن ہونے والی بربادی کے حوالے سے! دراصل ایسے معاملات میں ایک سال کا لیکھا جوکھا بھی بیان کرنا بہت طویل ہو جاتا ہے۔ ہم اگر پچیس سال پہلے کے حوالے سے اپنی بات کا آغاز کریں تو مختصراً یہی کہیں گے کہ ہماری خوشیوں کی تب کوئی حد نہ رہی، جب ہم نے پہلی بار اپنی ہونے والی شریکِ حیات کو ایک نظر دیکھا تھا۔ ساری دُنیا ایک دم سے حسین و جمیل ہوگئی تھی۔ گھربار، کھیت، درخت، چرند و پرند اور ہوائیں وفضائیں مست مست اور خوشگوار لگنے لگیں۔ تاحدِ نظر ہر چیز حسین اور پُر بہار ہوگئی۔ ایک بھینی بھینی خوشبو ہمیں ہر وقت گھیرے رکھتی۔

ہماری ہونے والی بیوی حور تھی یا محض یہ ہماری نظروں کا فتور تھا کہ ہم جیتے جی خود کو جنت کا مکین سمجھنے لگے۔ سسرال میں ہماری خوب آؤ بھگت کی جاتی اور ہم اپنی قسمت پر رشک کرنے لگتے۔

سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم اکثر اپنے سسرال پہنچ جاتے تاکہ اپنی ہونے

والی نصف بہتر کا دیدار کر سکیں۔ مگر اکثر ہم ناکام و نامراد لوٹ آتے اور خود کو خود ہی ڈھارس بندھاتے۔ ''بس کچھ ہی وقت کی بات ہے۔ یہ حور ہمارے ساتھ ساتھ رہا کرے گی اور ہمیں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کرے گی۔''

بس ہم نے جھٹ منگنی اور پٹ شادی کرنے کے لئے زور لگایا تاکہ دُشمنوں کو بیچ میں کہیں بگاڑ کرنے کا موقعہ نہ مل سکے مگر منگنی کے فوراً بعد اِس انکشاف نے ہمیں ہراساں کر دیا کہ لڑکی اِس شادی کے لئے راضی نہیں ہے۔ ''اب لڑکی راضی نہیں ہے تو اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لڑکی کے والدین، بہن اور بھائی تو سب ہی راضی اور خوش ہیں اور لڑکی کو راضی کرنا اُس کے والدین کا کام ہے۔'' ہم نے خود کو حوصلہ دیا۔

یہ آج سے پچیس سال پہلے کا وہ زمانہ تھا جب ہمارے معاشرے میں لڑکی کو اُس کی شادی کی بات بتانا غیر ضروری بلکہ معیوب سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی لڑکی سُن گُن پا کر بھولے سے اِنکار یا ناراضگی کا اِظہار کر دیتی تو اُس کی آواز کو بہ زورِ بازو دبا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ بالکل ایسا ہی ہماری ہونے والی بیوی کے ساتھ ہوا اور ہماری شادی ہو گئی۔

لوگ اور خصوصاً دوست یار ہمیں خوش قسمت جاننے لگے کہ ہم ہر لحاظ سے ایک اچھی بیوی کے شوہرِ نامدار بن گئے اور اُدھر ہم ہر وقت اِس خوف سے دوچار رہنے لگے کہ نہ جانے کب ہماری بیوی ہمیں الوداع کہہ دے۔ مگر اللہ بھلا کرے ہمارے سسرال والوں کا کہ اُن کی ساری ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں۔

اب کیوں تھیں؟ ہمارے خیال میں اِس کی چند مخصوص وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو یہی تھی کہ وہ برادری سے باہر رِشتہ دینا نہیں چاہتے تھے اور برادری کے اندر ہمارے علاوہ جو دیگر مشتاق تھے، وہ کئی باتوں میں ہماری برابری نہیں کر پاتے تھے۔ مثلاً ہم نہایت ہی حلیم طبع اور شریف النفس واقع ہوئے تھے اور عیب جوئی اور گالیوں سے پاک وصاف زبان کے مالک تھے، جبکہ دُوسرے اِن معاملات میں ہماری دُھول کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یوں ہم منظورِ نظر ہوئے۔

علاوہ ازیں ایک وجہ یہ بھی رہی تھی کہ سسرال والے پہلے سے ہی ایک بیٹی کی طلاق ہو جانے کی وجہ سے اُس کی دُوسری شادی کا خرچ اُٹھا چکے تھے اور اب وہ کسی صورت میں بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ دُوسری بیٹی کی دُوسری شادی کا جھمیلا اور خرچ کا بوجھ اُن کے سر پڑے۔

چنانچہ جب جب ہماری بیوی اپنے مائکے بیٹھ جانے کی ضد کرتی تو ہمارے سسرال والے بیٹی کو ذرا بھی منہ نہیں لگاتے۔ مجبوراً اُسے ہمارے پیچھے پیچھے آنا پڑتا۔ یہاں ہم یہ واضح کرتے چلیں کہ جس طرح خوبصورت بیوی کا شوہر ہونا اپنے آپ میں ایک مصیبت سے دوچار ہونا ہے، بالکل اُسی طرح ایک ایسی بیوی سے نبھاہ کرنا، جس نے محض دُوسروں کے دباؤ میں آکر شادی کی ہو، اپنے آپ میں کچھ کم سنگین نہیں ہے۔ بس ہمارے گھر کی گاڑی سسرال والوں کے دھکیلنے سے چلتی رہی۔

ہماری بیوی نے سوائے ہماری دیکھ ریکھ کے، گھر کے سارے کام سنبھال لئے تھے۔ کیسے نہ سنبھالتی؟ کھانا نہ پکاتی تو کھاتی کہاں سے؟ گھر کے کام اور رشتہ داروں کے تئیں اپنے فرائض نہ نبھاتی تو دُوسروں کے طعنوں اور نکتہ چینیوں کا شکار ہوتی اور نالائق کہلاتی۔ رہے ہم، تو ہمارے لئے وہ اوّل روز سے ہی پتھر کی سِل تھی، سِل ہی رہی اور اب پہاڑ بن چکی ہے۔ یہ محض ہماری آنکھوں کا فتور ہے کہ آج بھی ہمیں بیوی حور لگتی ہے، ایک حُسن پری لگتی ہے۔ دِل کو بھاتی ہے اور ہم ہر حال میں بیوی کے ساتھ نبھاہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ ہم اپنے نصیب میں بیوی کی خوشامدیں اور خاطر داریاں کرنا ہی لائے ہیں اور بیوی کی طرف سے اپنے لئے کچھ نہیں لائے۔

ہماری کئی حسرتیں، حسرتیں ہی رہیں۔ ہماری کبھی یہ قسمت نہ ہوئی کہ بیوی اپنی نرم نرم اُنگلیوں سے ہمارے بالوں میں کنگھی کر کے ہمیں جگائے اور چائے کا کپ ہاتھ میں تھمائے۔ چائے تو وہ ہمیں پلاتی ہے مگر ٹیبل پر پٹخ دیتی ہے۔ اگر ہم سوئے

رہنے کا بہانہ کرتے ہیں تو پاؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی ہے یا پھر کمبل بے دردی سے کھینچ لیتی ہے اور ایسے میں ہم دِل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔

کچھ ایسے ہی تلخ حالات اور ماحول میں جب ہم بیوی پر یہ احسان رکھتے ہیں کہ یہ صرف ہم ہی تھے جو تم سے نبھاہ کر پائے۔ تو وہ کہتی ہے ''نہیں! یہ صرف میں تھی جو تم سے نبھاہ کر پائی ہوں۔''

اور جب ہم کچھ دلائل کے ساتھ یہ واضح کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ نبھاہ کرنے کا حوصلہ ہم میں دیکھ کر ہی آپ کے والدین نے ہمارا انتخاب کیا تھا تو جواب میں وہ کہتی ہے ''یہ مت بھولو کہ میں نے صرف اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور مولوی کے کہنے پر ہاں کہی تھی۔''

''مگر کیوں 'ہاں' کہی تھی؟ 'نہیں' کہہ دیتی تو اچھا ہوتا۔''

''کیسے 'نہیں' کہتی؟ ابو گنّے کی مشین میں ڈلوا کر خون نچڑوا دیتے۔ بڑے بھائی فوج میں تھے، وہ گولی سے اُڑا دیتے۔ اماں زہر کی پُڑی دُودھ میں پلوا دیتیں اور وہ مولوی، وہ تو گلے پر چھری ہی چلا دیتا۔'' یہ اِنکشافات سُن کر اکثر ہمارا غُصّہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور ہمیں بیوی پر اور بھی پیار اور رحم آتا ہے کہ جس نے نہ صرف ہمیں قبول کیا بلکہ اب تک ہمارا گھر بھی بسائے رکھا ہے۔ مگر اپنے سسرال والوں کو بُری طرح کوستے ہیں کہ جنھوں نے تختۂ مشق کے لئے صرف ہمیں ہی منتخب کیا۔

تاہم کبھی کبھی باوجود ضبط کے جوش میں آجاتے ہیں۔ آخر مرد جو ٹھہرے۔ اُس رات ہم کھانے کی ناپسندیدگی کو لے کر جوش میں آگئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سالن میں نمک کی کمی بیشی کو لے کر اب تک کئی گھر اُجڑ چکے ہیں، ہم نے کھانے کی ناپسندیدگی پر ایک ہلّہ مچا دیا اور کھانے کی پلیٹ کو دُور پٹخ کر بھوکے پیٹ کمبل تان کر لیٹ گئے۔ خیال تھا کہ بیوی ہمیں منانے ضرور آئے گی۔ ہمارے اِس طرح کے حربے اکثر ناکام ہوتے رہے ہیں۔ اِس بار بھی ایسا ہی ہوا مگر بالکل ہی ایک نئے اور

خطرناک انداز میں۔

ہماری چہیتی بیوی، جس نے زِندگی کے اہم اور پورے پچیس سال ہمارے گھر میں گزارے تھے، پہلی بار رات کے اندھیرے میں اعلانیہ گھر چھوڑ کر بھاگ نکلی تھی اور ہم ساری اکڑ بھول گئے تھے۔ جاتے ہوئے وہ ایک خطرناک دھمکی دے گئی تھی

''اب آپ اِس گھر میں علی خان کی طرح رہیں گے!''

یہ جملہ سُنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم فوراً ہی بیوی کو پکڑنے کے لئے لپکے مگر تب تک وہ اندھیرے میں سما چکی تھی اور ہم کچھ دیر کے لئے کھسیانی بلی کی طرح اپنا ہی منہ نوچتے رہ گئے۔ اب علی خان اور ہم میں فرق بس اِتنا ہی رہ گیا تھا کہ علی خان اپنی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال چکا تھا اور اب بہوؤں اور بیٹوں سے نبرد آزما تھا کہ وہ اُس کی اچھی دیکھ ریکھ نہیں کرتے ہیں۔ وقت پر کھانا نہیں دیتے، کپڑے دھو کر نہیں دیتے وغیرہ وغیرہ۔

مگر ہم کسی طور پر بھی علی خان نہیں بننا چاہتے تھے۔ لہٰذا اندھیرے میں ہی کود پڑے اور گرتے پڑتے ڈھونڈ ڈھانڈ کر سو خوشامدوں سے بیوی کو گھر لائے۔ اب کھانے کی بھوک کس کم بخت کو تھی؟ مگر اُس نے پہلی شرط یہی رکھ دی۔

''آپ کھانا کھائیے۔ بھوکے پیٹ نیند نہیں آتی ہے۔ نہیں تو میں پھر بھاگ جاؤں گی اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔''

بس پھر کیا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی پٹخی ہوئی پلیٹ کو نہایت ہی سلیقے سے ہم نے اُٹھایا اور ہاتھ دھو کر کھانے بیٹھ گئے۔ مگر حیرت واستعجاب کی بات یہ تھی کہ اب وہی کھانا ہمیں نہایت لذیذ اور مزے دار لگ رہا تھا۔ نمک کی کمی بیشی کا رائی برابر احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اب کھاتے وقت ہماری اپنی حالت وکیفیت کیا رہی تھی؟ اِس کے بارے میں اب آپ یقیناً نہیں پوچھیں گے کیونکہ کچھ باتیں صرف محسوس کرنے کی ہوتی ہیں۔

○○○

رہنے کا بہانہ کرتے ہیں تو پاؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی ہے یا پھر کمبل بے دردی سے کھینچ لیتی ہے اور ایسے میں ہم دِل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔

کچھ ایسے ہی تلخ حالات اور ماحول میں جب ہم بیوی پر یہ احسان رکھتے ہیں کہ یہ صرف ہم ہی تھے جو تم سے نبھاہ کر پائے۔ تو وہ کہتی ہے ''نہیں! یہ صرف میں تھی جو تم سے نبھاہ کر پائی ہوں۔''

اور جب ہم کچھ دلائل کے ساتھ یہ واضح کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ نبھاہ کرنے کا حوصلہ ہم میں دیکھ کر ہی آپ کے والدین نے ہمارا اِنتخاب کیا تھا تو جواب میں وہ کہتی ہے ''یہ مت بھولو کہ میں نے صرف اپنے ماں باپ' بہن بھائیوں اور مولوی کے کہنے پر ہاں کہی تھی۔''

''مگر کیوں 'ہاں' کہی تھی؟ 'نہیں' کہہ دیتی تو اچھا ہوتا۔''

''کیسے 'نہیں' کہتی؟ ابو گنّے کی مشین میں ڈلوا کر خون نچڑوا دیتے۔ بڑے بھائی فوج میں تھے' وہ گولی سے اُڑا دیتے۔ اماں زہر کی پڑی دُودھ میں پلوا دیتیں اور وہ مولوی' وہ تو گلے پر چھری ہی چلا دیتا۔'' یہ اِنکشافات سُن کر اکثر ہمارا غُصّہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور ہمیں بیوی پر اور بھی پیار اور رحم آتا ہے کہ جس نے نہ صرف ہمیں قبول کیا بلکہ اب تک ہمارا گھر بھی بسائے رکھا ہے۔ مگر اپنے سسرال والوں کو بُری طرح کوستے ہیں کہ جنہوں نے تختۂ مشق کے لئے صرف ہمیں ہی منتخب کیا۔

تاہم کبھی کبھی باوجود ضبط کے جوش میں آجاتے ہیں۔ آخر مرد جو ٹھہرے۔ اُس رات ہم کھانے کی ناپسندیدگی کو لے کر جوش میں آگئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سالن میں نمک کی کمی بیشی کو لے کر اب تک کئی گھر اُجڑ چکے ہیں' ہم نے کھانے کی ناپسندیدگی پر ایک ہلّہ مچا دیا اور کھانے کی پلیٹ کو دُور پٹخ کر بھوکے پیٹ کمبل تان کر لیٹ گئے۔ خیال تھا کہ بیوی ہمیں منانے ضرور آئے گی۔ ہمارے اِس طرح کے حربے اکثر ناکام ہوتے رہے ہیں۔ اِس بار بھی ایسا ہی ہوا مگر بالکل ہی ایک نئے اور

خطرناک انداز میں۔

ہماری چہیتی بیوی، جس نے زِندگی کے اہم اور پورے پچیس سال ہمارے گھر میں گزارے تھے، پہلی بار رات کے اندھیرے میں اعلانیہ گھر چھوڑ کر بھاگ نکلی تھی اور ہم ساری اکڑ بھول گئے تھے۔ جاتے ہوئے وہ ایک خطرناک دھمکی دے گئی تھی
''اب آپ اِس گھر میں علی خان کی طرح رہیں گے!''

یہ جملہ سُنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم فوراً ہی بیوی کو پکڑنے کے لئے لپکے مگر تب تک وہ اندھیرے میں سما چکی تھی اور ہم کچھ دیر کے لئے کھسیانی بلی کی طرح اپنا ہی منہ نوچتے رہ گئے۔ اب علی خان اور ہم میں فرق بس اِتنا ہی رہ گیا تھا کہ علی خان اپنی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال چکا تھا اور اب بہوؤں اور بیٹوں سے نبرد آزما تھا کہ وہ اُس کی اچھی دیکھ ریکھ نہیں کرتے ہیں۔ وقت پر کھانا نہیں دیتے، کپڑے دھو کر نہیں دیتے وغیرہ وغیرہ۔

مگر ہم کسی طور پر بھی علی خان نہیں بننا چاہتے تھے۔ لہٰذا اندھیرے میں ہی کود پڑے اور گرتے پڑتے ڈھونڈ ڈھانڈ کر سو خوشامدوں سے بیوی کو گھر لائے۔ اب کھانے کی بھوک کس کم بخت کو تھی؟ مگر اُس نے پہلی شرط یہی رکھ دی۔

''آپ کھانا کھایئے۔ بھوکے پیٹ نیند نہیں آتی ہے۔ نہیں تو میں پھر بھاگ جاؤں گی اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔''

بس پھر کیا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی پٹخی ہوئی پلیٹ کو نہایت ہی سلیقے سے ہم نے اُٹھایا اور ہاتھ دھو کر کھانے بیٹھ گئے۔ مگر حیرت واستعجاب کی بات یہ تھی کہ اب وہی کھانا ہمیں نہایت لذیذ اور مزے دار لگ رہا تھا۔ نمک کی کمی بیشی کا رائی برابر احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اب کھاتے وقت ہماری اپنی حالت وکیفیت کیا رہی تھی؟ اِس کے بارے میں اب آپ یقیناً نہیں پوچھیں گے کیونکہ کچھ باتیں صرف محسوس کرنے کی ہوتی ہیں۔

○○○

دستک

گُھس پیٹھ کے صدقے میں جب سے ہمارے علاقے کے حالات خراب ہوئے تھے، ہم دیہاتیوں کی خوشگوار شامیں، سوگوار شاموں میں بدل گئی تھیں۔

اب کہ ہماری شامیں سانسیں روکے، دبے قدموں آتیں۔ راتیں سہمی سکڑی، آنکھیں میچے لرزلرز کر گزرتیں اور دِن تھکے ماندے بوجھل بوجھل قدموں سے گزر جاتے۔ کتنے ہی کام کاج خود بخود ہی ٹھپ ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ آپسی اِختلافات تو بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ آئے دِن کے حادثات نے لوگوں کو بے جان، لاغر اور نکمّا کر دیا تھا۔ دِن کو تلاشیاں اور شک وشبہ کی بنیاد پر پکڑ دھکڑ کا ڈر اور رات کو انجانی دستک کا خوف وہراس۔ نہ دِن کو چین نہ رات کو نیند اور دہشت وخوف کا عالم یہ کہ لوگ کھل کر سانس تک لینے سے گریزاں! جس رات ہمارے دروازے پہ دستک ہوئی، مانو ایک بھونچال آ گیا ہو۔ ایک ایسا بھونچال، جس نے عمارت کا تو کچھ نہ بگاڑا مگر مکینوں کے جسم وجان چُور چُور کر کے رکھ دئے تھے۔ اُس روز یہ دستک متوقع تھی ہی، مگر ایک آس بھی تھی کہ اللہ کرے یہ دستک، جس کے باعث بہت سے گھر ویران اور ملبے کا ڈھیر ہو چکے ہیں، جس کے باعث کتنے ہی بے گناہ زِنداں خانوں کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں، ہمارے دروازے پر کبھی نہ سُنائی دے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

پاپا اُس رات گھر پر نہیں تھے اور سچ بات تو یہ ہے کہ پاپا جان بوجھ کر شام سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ پاپا اکثر کہا کرتے ہیں کہ اُن کی چھٹی حِس ہمیشہ تیز کام کرتی ہے۔ مگر اُس روز صرف پاپا کی ہی نہیں، ہم سب گھر والوں کی چھٹی

جِس کہہ رہی تھی کہ آج دستک ہوسکتی ہے۔اس کے پیشِ نظر دِن کوسب گھر والوں نے ایک میٹنگ منعقد کی اور یہ تجویز رکھی کہ گھر کو مضبوط تالوں میں جکڑ کر گھر کے سارے افراد کسی اور جگہ پناہ لے لیں۔ کچھ دیر غور وخوض ہوتا رہا۔ جائے پناہ بھی ڈھونڈھ لی گئی' مگر اِس طرح کی ہجرت سے متعلق کچھ گزشتہ واقعات کی روشنی میں' اِس تجویز کو رد کردیا گیا کیونکہ اِس کا انجام کہیں اور زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔آخر پھر اسی گھر میں آکے رہنا ہے۔ بات ایک رات کی تو ہے نہیں۔ ہماری بستی کے حالات خراب ہوئے بھلے ہی چند سال ہوئے ہیں مگر ریاست کے دیگر حصّوں میں تو یہ حالات برس ہا برس سے چلے آرہے ہیں اور نہ جانے کب تک یہ سب افراتفری اور ظلم وستم ہوتے رہیں گے۔لہٰذا گھر بند کر کے یوں سب کا چلے جانا مناسب نہیں ہے۔

تب ممّی نے پاپا سے کہا ''آپ یوں بھی تو بیمار ہیں نا۔آپ چلے جائیے۔ہم کہہ دیں گے کہ اچانک کچھ تکلیف بڑھ گئی اور ہسپتال چلے گئے ہیں۔ بھلا جان بچانے کے لئے ذرا سا جھوٹ بول دینا کوئی بُری بات نہیں ہے۔سُنا ہے وہ اکیلے گھر میں داخل نہیں ہوتے ہیں۔ میں کہہ دُوں گی کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔آپ کہیں اور چلے جائیے۔ممکن ہے وہ میری بات مان لیں۔''

پاپا نے پہلے تو ''ہوں'' کہہ کر سر جھٹک دیا اور کہا ''اِس طرح اگر وہ اجازت کے ملنے یا نہ ملنے پر اِکتفا کرنے والے ہوں تو اُن کی صبح ہی ہو جائے۔'' ممّی نے کہا ''اور کوئی راہِ فرار ہے نہیں۔آپ کے چلے جانے سے ایک جواز ہاتھ آجائے گا اُن کو ٹالنے کے لئے۔'' پھر اِسی بات کو مناسب جان کر پاپا چلے گئے اور ہم اور زیادہ سہم گئے۔

یوں تو ہم اُسی دِن سے سہمے ہوئے تھے' جب یہ سُنا تھا کہ بستی میں وہ مہمان وارد ہو چکے ہیں' جن کی آمد اب تک شاید کسی بھی بستی اور کسی بھی علاقے کے لئے مبارک نہیں رہی ہے۔

بس جب سے مہمان وارد ہوئے تھے' ساری بستی پہ سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

دستک

گُھس پیٹھ کے صدقے میں جب سے ہمارے علاقے کے حالات خراب ہوئے تھے، ہم دیہاتیوں کی خوشگوار شامیں، سوگوار شاموں میں بدل گئی تھیں۔

اب کہ ہماری شامیں سانسیں روکے، دبے قدموں آتیں۔ راتیں سہمی سکڑی، آنکھیں میچے لرزلرز کر گزرتیں اور دِن تھکے ماندے بوجھل بوجھل قدموں سے گزر جاتے۔ کتنے ہی کام کاج خود بخود ہی ٹھپ ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ آپسی اِختلافات تو بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ آئے دِن کے حادثات نے لوگوں کو بے جان، لاغر اور نکما کر دیا تھا۔ دِن کو تلاشیاں اور شک وشبہ کی بنیاد پر پکڑ دھکڑ کا ڈر اور رات کو انجانی دستک کا خوف وہراس۔ نہ دِن کو چین نہ رات کو نیند اور دہشت وخوف کا عالم یہ کہ لوگ کھل کر سانس تک لینے سے گریزاں! جس رات ہمارے دروازے پہ دستک ہوئی، مانو ایک بھونچال آ گیا ہو۔ ایک ایسا بھونچال، جس نے عمارت کا تو کچھ نہ بگاڑا مگر مکینوں کے جسم وجان چُور چُور کر کے رکھ دئے تھے۔ اُس روز یہ دستک متوقع تھی ہی، مگر ایک آس بھی تھی کہ اللہ کرے یہ دستک، جس کے باعث بہت سے گھر ویران اور ملبے کا ڈھیر ہو چکے ہیں، جس کے باعث کتنے ہی بے گناہ زِنداں خانوں کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں، ہمارے دروازے پر کبھی نہ سُنائی دے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

پاپا اُس رات گھر پر نہیں تھے اور سچ بات تو یہ ہے کہ پاپا جان بوجھ کر شام سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ پاپا اکثر کہا کرتے ہیں کہ اُن کی چھٹی حِس ہمیشہ تیز کام کرتی ہے۔ مگر اُس روز صرف پاپا کی ہی نہیں، ہم سب گھر والوں کی چھٹی

جس کہہ رہی تھی کہ آج دستک ہوسکتی ہے۔اس کے پیشِ نظر دِن کو سب گھر والوں نے ایک میٹنگ منعقد کی اور یہ تجویز رکھی کہ گھر کو مضبوط تالوں میں جکڑ کر گھر کے سارے افراد کسی اور جگہ پناہ لے لیں۔ کچھ دیر غور وخوض ہوتا رہا۔ جائے پناہ بھی ڈھونڈھ لی گئی' مگر اِس طرح کی ہجرت سے متعلق کچھ گزشتہ واقعات کی روشنی میں' اِس تجویز کو رد کر دیا گیا کیونکہ اِس کا انجام کہیں اور زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔آخر پھر اسی گھر میں آ کے رہنا ہے۔ بات ایک رات کی تو ہے نہیں۔ ہماری بستی کے حالات خراب ہوئے بھلے ہی چند سال ہوئے ہیں مگر ریاست کے دیگر حصّوں میں تو یہ حالات برس ہا برس سے چلے آ رہے ہیں اور نہ جانے کب تک یہ سب افراتفری اور ظلم وستم ہوتے رہیں گے۔لہٰذا گھر بند کر کے یوں سب کا چلے جانا مناسب نہیں ہے۔

تب مّمی نے پاپا سے کہا'' آپ یوں بھی تو بیمار ہیں نا۔آپ چلے جایئے۔ ہم کہہ دیں گے کہ اچانک کچھ تکلیف بڑھ گئی اور ہسپتال چلے گئے ہیں۔ بھلا جان بچانے کے لئے ذرا سا جھوٹ بول دینا کوئی بُری بات نہیں ہے۔سُنا ہے وہ اکیلے گھر میں داخل نہیں ہوتے ہیں۔ میں کہہ دُوں گی کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔آپ کہیں اور چلے جایئے۔ممکن ہے وہ میری بات مان لیں۔''

پاپا نے پہلے تو ''ہوں'' کہہ کر سر جھٹک دیا اور کہا ''اِس طرح اگر وہ اِجازت کے ملنے یا نہ ملنے پر اِکتفا کرنے والے ہوں تو اُن کی صبح ہی ہو جائے۔'' مّمی نے کہا ''اور کوئی راہِ فرار ہے نہیں۔آپ کے چلے جانے سے ایک جواز ہاتھ آ جائے گا اُن کو ٹالنے کے لئے۔'' پھر اِسی بات کو مناسب جان کر پاپا چلے گئے اور ہم اور زیادہ سہم گے۔

یوں تو ہم اُسی دِن سے سہمے ہوئے تھے' جب یہ سُنا تھا کہ بستی میں وہ مہمان وارد ہو چکے ہیں' جن کی آمد اب تک شاید کسی بھی بستی اور کسی بھی علاقے کے لئے مبارک نہیں رہی ہے۔

بس جب سے مہمان وارد ہوئے تھے' ساری بستی پہ سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

لوگ نیم جان سے ہوگئے تھے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا بلکہ ہر کوئی ایک دُوسرے کے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ گزشتہ دِنوں کے دردناک واقعات و حادثات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ کوئی حبُ الوطنی کی بھینٹ چڑھ رہا تھا تو کوئی بغاوت کے اِلزام میں کام آ رہا تھا۔ غرض یہ کہ ہر طرف قتل و غارت اور بربریت کا دَور دورہ تھا۔ جانے کب کیا ہو جائے اور کب کوئی کسی اِلزام میں دھر لیا جائے؟ اِس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

بستی میں داخل ہونے کے بعد مہمانوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے سب سے پہلے اُس دُبلے پتلے نوجوان کو منتخب کیا' جس کا باپ اُس کے بچپن میں ہی مر چکا تھا اور جس کے رشتہ داروں نے نہ صرف اُس کی زمینیں ہڑپ کر کے بے وقت پڑا بوجھ اُس کے سر سے اُتارا تھا بلکہ بارہا اُسے مار پیٹ کر اِس قدر پختہ کر دیا تھا کہ وہ بڑی سے بڑی مار اور چوٹ کھا کر بھی اُف تک نہیں کرتا تھا۔ اُس نوجوان کا جرم بس اِتنا ہی تھا کہ اُس نے کسی سے پوچھ لیا تھا کہ اجنبی مہمان کس گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا' بیچارے کو مار مار کر بے سُدھ کر دیا گیا تھا۔ بھلا یہ مہمانوں کی مرضی' وہ جہاں چاہیں وہاں رہیں۔ جو اُن کے جی میں آئے وہ کریں۔ کوئی اُن کی ٹوہ میں کیوں رہے۔ یہ صرف دو دِن پہلے کا واقعہ تھا اور اِن سب باتوں کے باوجود ممّی کا اِصرار تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اجنبی مہمانوں کو اپنے گھر میں ہرگز نہ گھسنے دیں گی۔ بے شک اُنہیں گھر میں داخلہ نہ دینا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر ممّی نے بھی اپنے فیصلے سے ہم سب کو آگاہ کر دیا تھا۔

اُس رات ہم کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھا سکے اور اپنے اپنے کمروں میں سونے کے بجائے ایک ہی کمرے میں سونے کا بندوبست کیا۔ گرمیوں کے دِن تھے اور حالات خراب ہونے کی وجہ سے رات کے وقت ہوا کے لئے کھڑکیوں کے پٹ کھولنے کا یارا کسی میں بھی نہیں تھا۔ بستی کے سبھی لوگ مارے خوف کے سرِ شام ہی

کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اپنے اپنے گھروں کے اندر دُبک جاتے تھے۔

اُس رات ہم نے بھی بہت ہی اہتمام اور احتیاط سے کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کیا اور اِس سے پہلے گھر کے باہر اور آس پاس سے وہ تمام آثار ہٹا دیئے تھے جو گھر کے اندر اِس کے مکینوں کی موجودگی کا اتہ پتہ دینے کا موجب ہوتے ہیں۔

روشن دانوں میں لگے شیشوں پر تو کوئی ڈھائی تین سال پہلے ہی ہم نے کالے رنگ کے موٹے کاغذ چپکا دیئے تھے تا کہ رات کے وقت گھر کے اندر کی روشنی باہر نہ جھانک سکے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹوں میں جہاں کہیں بھی کوئی سوراخ یا درز تھی، اُس میں ممّی نے مٹّی بھر دی تھی۔ یہ سب تدابیر اِس لئے کی گئی تھیں کہ رات کے وقت کوئی اجنبی راہ گیر روشنی کی کرن دیکھ کر اِدھر کا رُخ نہ کرے۔

اُس رات ہم نے کھڑکیوں کی اُوپری اور نیچے کی دونوں چٹخنیاں چڑھا دیں اور دو دو بار چیک بھی کیا کہ کہیں کوئی خامی نہ رہ گئی ہو۔ ہم نے سب کمروں میں روشنی جلا کر چیک کیا کہ کہیں کوئی گھر کے اندر ہی کسی کونے میں چھپا بیٹھا نہ ہو، جیسا کہ بعض فلموں میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ گھر کا مالک اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھول کر جب اپنے گھر کے اندر داخل ہوتا ہے، تو کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا جانی دُشمن یا پھر کوئی ڈاکو وغیرہ پہلے سے ہی اُس کے ڈرائنگ رُوم میں براجمان ہوتا ہے یا پھر الماری میں چھپا بیٹھا کوئی اچانک سامنے نکل آتا ہے۔ ممّی نے تو دیوان تک کھول کر چیک کیا۔ سامنے اور پچھواڑے کے دروازے سے لے کر سب کمروں کو مقفل کر دینے کے بعد ہم یوں مطمئن اور شانت ہو کر بیٹھ گئے جیسے ہم نے اپنے چاروں طرف لوہے کی فصیل کھڑی کر دی ہو۔ تبھی ایک بے حد حسّاس سا سوال ممّی کے ذہن میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم نے اپنے گھر کو تو مقفل کر دیا مگر ہماری سرحدیں......! ہم نے ایٹم بم تو بنا لئے مگر ہماری سرحدیں...... ہماری سرحدیں......!"

OOO

راہ کا روڑا

میں نے بھری محفل میں اُس کی بے عزتی کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ بعد میں جو اُس کی لعنت ملامت کی، وہ تو الگ رہی۔ اُس نے جوں ہی میرے آفس میں قدم رکھا تو میں نے اُس پر ایک ہتک آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ اُس نے مجھے سلام کیا مگر میں نے اُس کی آمد کارائی برابر نوٹس نہ لیتے ہوئے اُس کے سلام کا جواب تک نہ دیا۔

اگرچہ میرے آفس میں پہلے سے موجود لوگوں میں سے چند نے اُسے ''آیئے جی، آیئے جی۔ آپ کا ہی اِنتظار ہو رہا تھا'' کہہ کر اُس کا اِستقبال کرتے ہوئے اُس کی آمد پر خوشی کا اِظہار کیا مگر مجھے اُن لوگوں کا یہ انداز بہت بُرا لگا اور میں نے اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے بلند آواز میں کہا ''بھئی! اپنے موضوع پر آؤ۔ اِسے چھوڑو۔ اِس کا ہر کام لیٹ ہوتا ہے اور خراب ہوتا ہے۔ میں نے آج تک اِس کی کوئی بھی کارکردگی نہیں دیکھی ہے۔'' مگر اِتنا کچھ کہہ کر بھی میرا لاوا ٹھنڈا نہ ہوا۔

''سب کو دو ماہ ہوئے کنٹری بیوٹ کئے ہوئے اور تمہارے کمپلیکس کا ہمیں آج تک رِسپانس کیوں نہیں ملا؟'' ایک سخت اور اچٹتی سی نِگاہ اُس پر ڈالتے ہوئے اب میں اُس سے سخت لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

''جی کچھ لوگ متفق نہیں ہو پارہے تھے۔ اِس لئے دیر ہوگئی۔'' اُس نے پُرسکون اور ملائم لہجے میں جواب دیا۔

''کون متفق نہیں ہو پارہا تھا اور کیوں؟ نام بتاؤ مجھے۔''

میں چاہتا تھا کہ وہ کسی کو نامزد کرے۔ ایسی صورت میں، میں اُن دونوں کو آپس میں ٹکرانے کا اہتمام کر سکتا تھا۔ مگر جواب دینے سے پہلے وہ ذرا سا مُسکرایا، جیسا کہ وہ میرا مقصد بھانپ گیا ہو اور نام بتانے سے مکمل گریز کرتے ہوئے کہا۔

''جی، جی کچھ لوگ آپ کے حوالے سے کہہ رہے تھے کہ آپ ہمارے ہاں ہونے والے فنکشن میں جلوہ افروز نہیں ہو سکے اور اب ہم بھی آپ کے فنکشن میں شمولیت نہیں کریں گے۔''

بس اُس کی اِس بات نے مجھے وہ سب کچھ کہنے کا جواز مہیا کر دیا جو میں کہنا چاہتا تھا۔ میں اُس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ لہرا کر ایک دم بھڑک اُٹھا۔

''جس اِدارے کے بارے میں مجھے آئے دِن شکایتیں ملتی ہوں، میں کیوں ایسے گھٹیا اِدارے میں جانے لگا تھا؟ مجھے کون سا تمغہ ملنا تھا وہاں سے؟ میں لعنت بھیجتا ہوں وہاں۔''

''جی میں نے اب سب کو قائل کر لیا ہے اور آج میں کنٹری بیوشن دینے آیا ہوں۔'' وہ پھر اُسی ملائم لہجے میں گویا ہوا۔

''اب نہیں لینی ہے ہمیں تم لوگوں کی کنٹری بیوشن۔'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر کرخت آواز میں کہا۔

''جی، میں آج آیا ہی اِس لئے ہوں۔'' اُس نے اور ملائمت سے کہا۔

''میں جانتا ہوں تم کس لئے آئے ہو........اب رہنے بھی دو۔'' میرا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ اب میرے دفتر میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بول پڑے۔

''جناب معاف کریں۔ اِس بات کو مسئلہ نہ بنائیں۔ اب لے ہی لیتے ہیں۔'' مگر میں نے اپنے منہ سے پھر بھی ہاں نہیں کہا اور ناک بھوں چڑھا کر اپنا غصہ بدستور بحال رکھا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں نے اُس کی بے عزتی پہلی بار کی ہو۔ میں بسا اوقات

بھری محفل میں اُس کو اِسی طرح بے عزت کر چکا تھا۔ اُس کے واقف کاروں اور رِشتہ داروں کے سامنے اِشاروں، کنایوں میں اُس کی نا اہلی کے گیت بار ہا گا چکا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ سچ مچ کا نا اہل تھا بلکہ اُس کی کارکردگی قابلِ ستائش تھی۔ وہ کسی بھی مسئلے کو کمالِ شائستگی سے سلجھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مگر تھا تو میری راہ کا روڑا۔ میں اُسے ٹھوکر کیوں نہ مارتا، جب کہ میرے پاؤں میں ایک مضبوط اور محفوظ جوتا بھی پڑا تھا۔

میں ایک زونل آفیسر تھا اور وہ اپنے اِنسٹی ٹیوشن کا ہیڈ تھا اور میرے ماتحت تھا۔ مگر گزشتہ پانچ سالوں سے باوجود کوشش کے میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

جس اِدارے کا وہ سربراہ تھا، اُس میں کام کرنے والے لگ بھگ سبھی میرے حقیقی رِشتہ دار تھے اور جو نہیں تھے، اُن پر بھی میری مہربان نظریں سایہ فگن تھیں۔

اُسی کے اِدارے میں اُسی کے ماتحت کام کرنے والوں کی طرف سے مجھے اُس کے خلاف ایک شکایت نامہ موصول ہوا۔

شکایت نامہ لکھنے اور مجھ تک پہنچانے والے کے علاوہ دیگر سات لوگوں کے دستخط بھی ہوئے تھے جنہوں نے مجموعی طور پر شکایت نامہ میں لکھا تھا کہ مذکورہ شخص نہ صرف ہمارے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے بلکہ ناشائستہ الفاظ بھی اِستعمال کرتا ہے اور ہم اِس سے نجات چاہتے ہیں۔

میں نے اُسے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اپنے معمول کے مطابق اُس نے پردہ سرکا کر اِجازت چاہی اور جواب نہ پا کر ساتھ ہی سلام کیا۔ سلام کے جواب میں میرے سر کا اِشارہ پا کر وہ اندر داخل ہوا اور ابھی کُرسی پر ٹکا ہی تھا کہ میں نے اپنی فائل سے ایک لمبا سا کاغذ نکال کر اُس کے سامنے رکھتے ہوئے ہتک آمیز لہجے میں کہا۔

''اِسے پڑھو۔''

اُس نے جب پڑھا تو جیسے اُس کی نظریں پھٹ گئی ہوں۔ جیسے اُس پر منوں بوجھ آن پڑا ہو۔

''یہ سب کیا ہے؟ تم اپنی من مانی کر رہے ہو۔ ڈکٹیٹر بن کر حکمرانی کر رہے ہو؟'' میں نے اُس سے پوچھا۔ حالانکہ اُس وقت ڈکٹیٹر شپ کا جیتا جاگتا ثبوت تو میں خود ہی تھا مگر اُس نے مجھے کچھ کہنے کے بجائے کاغذ پر ایک جگہ اپنی اُنگلی ٹکاتے ہوئے دبی کچلی آواز میں کہا۔

''جناب اِس کو چھوڑ کر باقی سب دستخط جعلی ہیں۔ چھُٹی کو لے کر اِس کے ساتھ میری تُو تُو میں میں ہوئی تھی لیکن باقی سب فراڈ اور جھوٹ ہے۔''

میں اور بھڑک اُٹھا کیونکہ اُس نے مجھے حقیقت بتائی تھی۔ میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے' میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا ہوں۔ تم فوری طور پر اپنے اِختلافات ختم کرو اور اِدارے کی بہتری کی فکر کرو۔ تمہارے پاس صرف دو دِن کا وقت ہے۔ اپنی زیادتیوں کی معافی مانگو ورنہ میں اِسی شکایت نامے کی بنیاد پر تمہیں سسپینڈ کر کے کسی اور کو ہیڈ آف دی انسٹی ٹیوٹ مقرر کر دوں گا۔'' میں نے حتمی لہجے کا انداز اپناتے ہوئے کہا۔ اُس کی بولتی بند ہوگئی۔ چند لمحے وہ وہیں بیٹھا رہا اور پھر بوجھل قدموں سے آفس سے باہر چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ اب وہ اپنے دفتر جا کر اپنے ماتحتوں پر بگڑے گا۔ اُنہیں جھوٹا کہے گا اور لڑ جھگڑ کر وہ خود میرے پاس آئے گا یا پھر اُس کے ماتحت۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ مجھے رپورٹ ملی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور میں ناکام و نامراد منہ تکتا رہ گیا تھا۔ بھلے ہی میں نے اُسی کے ماتحتوں میں سے کسی ایک کا سہارا لے کر ایسے ہی دو حربے اور بھی آزمائے مگر اپنے اصل مقصد کو پھر بھی نہ پا سکا۔ اب کہ میں نے ادارے سے ملحقہ اُس کے پڑوسیوں کو خود درِ پردہ رہ کر اِستعمال کیا اور اِدھر اُس کو دفتر بُلا کر بھری محفل میں خوب لتاڑا۔

''تمہارے اِدارے کے پتھر اینٹیں اکھاڑ کر لوگ لے گئے ہیں۔ تمہارے اِدارے کو لوگ مویشی خانہ اور چراگاہ کے طور پر اِستعمال کر رہے ہیں۔ تمہارے گراؤنڈ میں گوبر کے ڈھیر لگے ہیں۔ زمین کھودتے کھودتے لوگ عمارت کی بنیادوں تک پہنچ گئے ہیں اور تم وہاں کس مرض کی دوا ہو؟ باہر کے لوگ آ آ کر مجھے اِطلاع دے رہے ہیں اور تم نے آج تک مجھے رپورٹ نہیں کی۔ کیسے نااہل شخص ہو۔ تم آج ابھی اور اِسی وقت لکھواور اُن لوگوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرو۔''

اُس نے لکھا اور مجھے دِکھایا۔ میں نے غصے سے اُس کے لکھے ہوئے کو یکسر قلم زد کر دیا اور اُسی کاغذ کے دُوسری طرف خود لکھ کر دیا اور کہا کہ ''اب اِس کو نئے کاغذ پر لکھ کر دو۔ اُس نے پہلے میرا لکھا ہوا پڑھا اور ایک جگہ اُنگلی ٹکا کر پوچھا۔

''جناب' یہ کیا لکھا ہے؟'' اور جب میں نے اُسے پڑھ کر سنایا تو وہ فوراً بول پڑا۔

''مگر ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ پڑوسیوں نے ہمیں کبھی گالیاں نہیں دیں۔ کبھی لاٹھیاں لے کر ہمارے پیچھے نہیں بھاگے۔ اُنہوں نے جب کوئی مداخلت کی، ہم نے اُنہیں سمجھایا اور بس۔''

''بھئی تم کیسی جاہلوں سی باتیں کرتے ہو۔ یہ پولیس کیس بنے گا اور پولیس میں جانے کے لئے کچھ اپنے پاس سے نمک مرچ بھی لگانا پڑتا ہے۔'' میں نے پھر اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

وہ حیرت میں پڑ گیا مگر فوراً ہی سب کچھ لکھ کر دے دیا۔ میں نے اُسی کو تھانے بھیجا کہ خود جا کر اپنا کیس رجسٹر کروا آؤ۔

پولیس نے موقعہ دیکھا اور پڑوسیوں کو اپنی زبان سے روشناس کرایا۔ یوں پڑوسیوں پر دخل اندازی کا کیس بنا۔ اب پڑوسی اُس کے خلاف شکایت لے کر کیوں نہ میرے پاس آتے! مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ کسی کو بھی اُس سے کوئی شکایت لاحق نہ

ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد صرف ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''جناب اِدارے کا سارا نظام درہم برہم ہے۔ چند لوگ بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ سارا اِدارہ ڈیفنکٹ ہو چکا ہے۔ آپ اِدارے کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ سونپ دیجئے۔''

میں اگر مخلص ہوتا تو اُس شخص سے یہ ضرور پوچھتا کہ بھئی، جس اِدارے کے کارکنوں میں خود تمہاری ایک عدد بیوی بھی شامل ہے، تم اُسی کے بارے میں شکایت لے کر میرے پاس آئے ہو اور کہہ رہے ہو کہ وہ ڈیفنکٹ ہوا پڑا ہے۔

مگر میں ایسا کیوں کہنے لگا تھا۔ میری نظریں تو اپنے شکار پر لگی تھیں۔ میں تو یہی چاہتا تھا کہ کہیں نہ کہیں سے اُس پر کوئی وار ہوتا ہی رہے۔ میں نے اُسے اور بھی بھڑکاتے اور اہمیت دیتے ہوئے کہا۔

''بھئی! اِدارے کا ہیڈ ایک نااہل آدمی ہے، مگر سینئر ہونے کے وجہ سے ہیڈ بنا بیٹھا ہے۔ اُس کے خلاف اگر کوئی مضبوط قسم کا کیس بن جائے تو اُس کی سینیارٹی ختم کی جاسکتی ہے۔''

دراصل میں چاہتا تھا کہ وہ شخص اُس کے خلاف تحریری طور پر کچھ مسودہ تیار کرکے لائے۔ بے شک میں یہ بخوبی جانتا تھا کہ اُس آدمی کی شکایت کے پیچھے کا معاملہ بس یہی تھا کہ اِدارے کے سربراہ نے اُس کی بیوی کو اور دیگر کارکنوں کو بھی سرکاری اِداروں سے ملنے والی ''فرلو'' جیسی رعایات، آرام طلبی اور دیگر آسائشوں سے محروم رکھا ہوا تھا۔

اُس روز جو میں نے اُسے دفتر میں طلب کیا تو اُس کے خلاف ہونے والی گزشتہ ساری شکایتوں کا حوالہ دیتے ہوئے، بھری محفل میں اُس پر بھرپور وار کیا۔ ناک بھوں چڑھا کر، ہتک آمیز نظروں سے بارہا اُسے دیکھا۔ میں خوب گونجا اور برسا، یہاں تک کہ مجلس میں بیٹھے دیگر لوگ بھی میرے اُس رویہ پر دنگ رہ گئے۔ مگر اُس کے

تلوے بھی نہ بھیگے اور مجھے اُس کی نظروں سے یوں لگا جیسے کہ وہ مجھے ایک خاموش پیغام دے رہا ہو۔ ''میں تمہیں اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دُوں گا۔''

ایسا نہیں تھا کہ وہ بالکل خاموش سر جھکائے میری بے عزتی برداشت کرتا رہا بلکہ وہ بھی جواب میں کچھ نہ کچھ بولتا ہی رہا۔ اگرچہ میں نے اُس کی ہر بات کاٹتے ہوئے اُسے بولنے کا بہت ہی کم موقعہ دیا تھا۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ بول ہی گیا تھا۔ مثلاً جب میں نے اُسے کہا ''اپنے اِدارے میں سدھار لاؤ۔'' تو اُس نے مجھے کہا۔

''آپ اپنے زون میں سدھار لاؤ۔ اُس کی حالت کچھ زیادہ ہی خستہ ہے۔''

میں نے جب اُسے کہا کہ ''تمہارے اِدارے میں کوئی موجود ہی نہیں ہوتا ہے۔'' تو اُس نے جواب میں کہا ''کسی دِن اچانک آ کے دیکھ لیجئے۔ سبھی موجود ہوں گے، مگر آپ کے زون کے چالیس سے زائد لوگ تین تین اور چار چار سالوں سے یہاں سے غائب ہیں اور آپ اُن کی تنخواہیں برابر نکال کر اپنا حصہ بٹور رہے ہیں۔''

اور پھر جب میں نے اُسے چند سال پہلے کا واقعہ یاد دِلاتے ہوئے کہا۔

''یاد ہے تمہارے اِدارے کا حاضری رجسٹر مجھے اُٹھانا پڑا تھا مگر میں نے رعایت سے کام لیتے ہوئے کوئی ایکشن نہیں لیا۔'' تو اِس کے جواب میں اُس نے کہا۔

''اگر آپ ایکشن لیتے تو پھنسنے والے آپ کے رِشتہ دار تھے۔ میں نہیں تھا۔''

اُس کم بخت نے مجھے اِسی نوعیت کے کئی اور جواب دئے تھے مگر اِس قدر شائستہ، ملائم اور دھیمے لہجے میں کہ میں خود بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اُس نے کڑوی کسیلی گولیاں مکھن اور ملائی میں لپیٹ کر میرے حلق میں ٹھونس دی تھیں، جنہیں نگلے بنا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ اگر یہی باتیں وہ مشتعل اور برانگیختہ ہو کر کہہ دیتا تو میں یقیناً اُس لمبے تڑنگے شخص کے گریبان تک پہنچ جاتا۔ جواباً وہ میرا گریبان نہیں بھی پکڑتا تو بھی پولیس کو بُلوانے کا مجھے جواز مل جاتا۔ اُدھر اُس پر آفس میں آ کر اپنے آفیسر پر حملہ کرنے کا کیس بن جاتا اور اِدھر میں خود اپنے ہاتھوں اُس کی سروس بُک پر اُس کی کارکردگی،

چال چلن اور مزاج سے متعلق غلط ریمارکس لکھ کر اُس کی آج تک کی ساری کارکردگی پر کالک پوت دیتا۔ مگر بھٹی میں سے نکلے ہوئے اُس اِنسان نے مجھے یہ نادر موقعہ کبھی نصیب ہی نہیں ہونے دیا اور میں اپنی آگ میں ہی جلتا کڑھتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ اُدھر اُس کی مزید پرموشن کے دِن نزدیک آرہے تھے تو اِدھر میری ریٹائرمنٹ کے۔

گزشتہ پانچ سالوں میں، میں اگرچہ اُس کی ساکھ خاصی حد تک بگاڑ چکا تھا مگر اُس کی سروس بُک کا بال بھی بیکا نہیں کرسکا تھا اور پھر میں ناکام ونامراد اُٹھاون سال کا ہوگیا اور آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا اور جس کے نہ ہونے کے لئے میں گزشتہ پانچ سالوں سے کوشاں رہا تھا۔ میری ریٹائرمنٹ کے کچھ ہی عرصہ بعد پرموشن لسٹ نکلی اور وہ سلیکٹ ہوگیا اور میرا اپنا بیٹا صرف چند ہی دِن اُس سے جونیئر ہونے کے باعث چار پانچ سال کے لئے پیچھے چلا گیا تھا۔ میں اِنتہائی صدمے سے دوچار ہوا مگر میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ اب میرے بیٹے کو مزید کئی سال کے لئے اُسی کے ماتحت کام کرنا تھا اور اپنی پرموشن کا اِنتظار بھی۔ چونکہ کچھ ویکنسیز خالی ہونے پر ہی تو اگلی پرموشن لسٹ کے نکلنے کا دارومدار تھا۔

مگر میری حیرت اور خوشی کی اِنتہا نہ رہی جب اُس نے ڈیپارٹمنٹ کو لکھ کر دیا کہ میں کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر اِس پوسٹ کو منظور کرنے سے قاصر ہوں اور اپنے پہلے والے عہدے پر ہی برقرار رہنا چاہتا ہوں۔

اب یہ پوسٹ میرے بیٹے کے لئے مخصوص ہوگئی تھی۔ اب آٹومیٹیکلی میرے بیٹے کو اُسی پوسٹ پر براجمان ہونا تھا اور بالکل ایسا ہی ہوا۔

اُس کے اِس فیصلے سے جہاں مجھے راحت اور خوشی کا احساس ہوا وہیں نہ جانے کیوں ایسا بھی لگا کہ جیسے میری طرف سے کی گئی ساری زیادتیاں اور بے عزتیاں اچانک ہی اُس نے میرے منہ پر دے ماری ہوں۔

ooo

دہشت کا سماں

دہشت کا سماں —— چاروں طرف پھیلا ایک انجانا سا خوف و ہراس اور ایسے میں قتل کی ایک اور واردات!

''آپ لوگوں نے کچھ سُنا! کہتے ہیں، سیما کو آج رات کسی نے مار دیا۔''

کہنے والے نے فق چہرے سے کچھ غیر یقینی انداز میں یہ الفاظ کہے تھے اور یہ اِطلاع سیما کے پڑوس میں رہنے والی اُس کی پھوپھی زاد بہن حنا کے لئے اور حنا سے بھی کہیں زیادہ میلوں دُور رہنے والے سیما کے والدین اور بہن بھائیوں کے لئے اِس قدر لرزہ خیز، حیرت کُن اور غیر یقینی تھی کہ جس کا بیان احاطۂ تحریر میں لایا جانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ ایک سیدھے سادھے، جیتے جاگتے اور جانے پہچانے وجود کے متعلق اچانک ہی یہ اِطلاع ملے کی وہ مرا نہیں بلکہ اُسے مار دیا گیا ہے۔ تو سننے والے پر کیا گزرے گی، یہ صرف وہی جان سکتا ہے۔

کُل نفس ذائقة الموت ۔ ایک نہ ایک دِن ہر کسی کو مرنا ہی ہے۔ کوئی بیمار رہ کر مرتا ہے تو کوئی لمبی عمر کاٹ کر مرتا ہے۔ کسی کا کام دھندا ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت موت کو اپنا لینے کے لئے تیار رہتا ہے مگر ایک جوان اور معصوم وجود، جو کل تک آپ کے ساتھ ساتھ رہا ہو، جس میں زِندگی کی ساری اُمنگیں اور خواہشیں باقی ہوں، جو اپنے دُکھ درد چھپا کر ہنسنا جانتا ہو کہ اُسے زِندگی ہر حال میں عزیز ہے، راتوں رات کوئی اُس کی دُنیا اُس سے چھین لے۔ اُسے مار دے۔!

''آہ سیما! دُنیا کے سٹیج پر تمہارا وقت اور تمہارا رول کتنا مختصر رہا اور تمہارا انجام

کس قدر دردناک ہوا۔'' حنا اپنی ماموں زاد بہن کے لئے سینہ پیٹ کر تڑپ اُٹھی۔

''مگر کس نے؟ سیما کو کس نے مار دیا؟ اُس کے ساتھ کسی کی کیا دُشمنی تھی؟''

یہ الفاظ حنا کی ساس اماں کے تھے۔ وہاں موجود لوگوں میں حنا کے سوا مقتولہ کے اپنوں میں سے بے شک کوئی نہیں تھا مگر اِس ہولناک خبر سے سب پر ہی سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ہر کوئی ایک انجانے خوف سے دوچار تھا۔ ''جانے کب کس کی باری آجائے۔'' علاقے کے حالات کچھ ایسے ہی تو بن چکے تھے۔

شدید پچھتاوے سے حنا کا کلیجہ کٹنے لگا تھا کہ پاس ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی ماموں زاد بہن کو بچا نہیں پائی۔ اُس کے لئے کچھ بھی نہیں کر پائی۔ کاش! کل وہ اُسے گھر جانے سے روک لیتی۔ ایک رات کا ہی تو فاصلہ پڑا اور وہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ کل اُسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ آج اُس کی صبح نہیں ہوگی؟

اِس میں کوئی شک نہیں کہ کل بعد دوپہر تک سیما اپنا سال بھر کا بچہ لئے حنا کے گھر میں موجود رہی تھی۔ اُس کے رُوبرو بیٹھ کر کتنی ہی دیر تک اُس سے باتیں کی تھیں۔ دُکھوں، دردوں کے کچھ نئے ابواب کھولے تھے اور اُس کی باتیں سن کر حنا نے اپنے اندر پیدا ہونے والے ایک خدشے سے آگاہ کرتے ہوئے اُسے کہا تھا ''سیما جان! بچ کے رہنا۔ وہ لوگ تمہیں کہیں کسی بہانے سے مار ہی نہ ڈالیں۔''

''نہیں تو! وہ کیوں مجھے ماریں گے۔؟ میں اُنہیں کب کچھ کہتی ہوں اور اِتنا بڑا اقدم وہ نہیں اُٹھا سکتے ہیں۔ آخر میں بچے کی ماں ہوں آپی۔''

حنا کی اِس بات پر اُسے سخت حیرت ہوئی تھی اور اُس کے مزید آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ''نہیں تو!'' کہہ کر منفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے زبان کی نوک دانتوں کے بیچ تک لے آئی تھی کہ حنا آپی نے اِتنی بڑی بات کہہ دی جو ممکن ہی نہیں۔

حنا نے اُسے ہلکی سی خفگی سے ڈانٹا ''تم بڑی خراب لڑکی ہو سیما۔ روتے روتے ہنس بھی پڑتی ہو اور پھر تمہاری آنکھیں، یہ تمہاری آنکھیں تو ہر وقت مسکراتی ہی

نظر آتی ہیں۔ کوئی تمہاری باتوں پر یقین کرے بھی تو کیسے کہ تم ایک دُکھی لڑکی ہو۔''

وہ اور بھی مُسکرادی۔ ''آپی کیا کروں؟ رونے دھونے سے بھی تو کچھ نہیں نا بنتا اور پھر میں اپنی باتیں کسی اور سے تھوڑی ہی کرتی ہوں، صرف آپ سے ہی کرتی ہوں، اور آپ بھی کسی اور سے ذِکر مت کرنا۔ اور آپی اُن لوگوں کی باتیں اور اُن کی حرکتیں اِتنی عجیب ہیں کہ بس روتے روتے ہنسی بھی آجاتی ہے۔''

''ایسے لوگوں کا کچھ بھروسہ بھی نہیں ہوتا ہے۔'' حنا نے پھر سے اپنے خدشے کا اِظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسے لوگ بس اپنے ہی مطلب کے ہوتے ہیں اور لالچ کے لئے تو کوئی کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''نہیں آپی!'' اُس نے پھر سے منفی انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ ''اُن کا مقصد صرف مجھے تنگ کرنا اور ڈرانا دھمکانا ہے۔ وہ مجھے کیوں ماریں گے؟ بچے کی ماں جو ہوں۔'' اُس نے گود میں اُٹھائے بچے کو والہانہ انداز میں چوم لیا تھا۔ حنا خاموشی سے اُس کے روتے مسکراتے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر دِن ڈھلے وہ اپنے گھر چلی گئی۔ گھر چاہے کیسا ہی ہو، کانٹوں سے بھرا ہو یا بھوکا ننگا ہو، اندر سے کتنا ہی خالی خالی ہو مگر اپنے مکینوں کے لئے بڑی ہی کشش رکھتا ہے۔ حنا لاکھ چاہتے ہوئے بھی اُسے روک نہ سکی اور پھر اگلی ہی صبح سورج نکلنے سے پہلے پہلے ہی بُری طرح تڑپا دینے والی یہ خبر سُننی پڑی کہ سیما کی دُنیا اُس سے چھین لی گئی ہے۔

حنا کی ساس اماں نے پھر سے اپنے الفاظ دہرائے۔ ''کچھ پتہ تو چلے کہ کس نے مارا اُسے؟''

وہاں گھر کے صحن میں اب لگ بھگ بھیڑ سی لگ چکی تھی کیونکہ حنا مرنے والی کی بہن تھی۔ ہر کسی کے بند لبوں پر یہی سوال تھا ''کس نے اور کیوں؟'' مگر خوف نے سب کے منہ جیسے سی رکھے تھے۔ پھر ایک دبی دبی سی مردانہ آواز اُبھری۔

''جی۔ میں نے تو ایسے ہی سُنا ہے کہ رات کو کچھ ہتھیار بند لوگ گھر میں داخل

ہوئے۔ گھر کے سب لوگوں کو ایک کمرے میں بند کیا اور سیما کو اپنے ساتھ لے گئے اور پھر رات بھر سیما.........''

''نہیں! جھوٹ' بالکل جھوٹ۔ سچ کیا ہے' میری سیما کو کس نے مارا ہے؟ یہ میں بتاؤں گی مگر پہلے اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ لوں تو۔''

روتی بلکتی حنا اور بھی تڑپ کر چیخ پڑی اور سیما کے گھر کی جانب' جو کہ دو ڈھائی کلومیٹر کے فاصلہ پر ہی واقع تھا' دوڑ پڑی۔ مگر اُس کی ساس اماں نے آگے بڑھ کر پکڑا اور جھنجھوڑ ڈالا ''تو پاگل ہوئی ہے کیا؟ تیرے میرے سچ بتانے سے کیا مرنے والی جی اُٹھے گی۔ تُو کچھ جانتی ہے تو بھی زبان بند رکھ۔ سچ جھوٹ بتانے کا زمانہ ہی نہیں رہا ہے۔ اپنی زبان بند رکھ سکتی ہے تو اُس کے آخری دیدار کو چل' نہیں تو تمہارا گھر میں رہنا ہی بہتر ہے۔''

حنا کی ساس اماں' سیما کی ساس کی سگی بہن تھی۔ وہ حنا کے کڑے تیور دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔ ''نہ جانے حنا کے پاس کیسا اور کون سا سچ ہے؟ مرنے والی تو اب مر ہی گئی مگر گھر والوں کو کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے۔'' اِس لئے اُس نے حنا کو سختی سے تاکید کی کہ فی الحال وہ اپنی زبان بند ہی رکھے۔ اُدھر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں سے چند نے تائید بھی کر دی۔ ''جی ہاں! ایسے حالات میں اپنی زبان بند رکھنا ہی بہتر ہے۔ ہمارے اپنے ہی گاؤں میں اب تک بیسیوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ کتنے ہی ہنستے بستے گھر راتوں رات ویران ہو گئے ہیں۔''

''جی ہاں! کون کسی کو کب اور کیوں مارتا ہے' کچھ پتہ ہی نہیں چلتا ہے۔ ایک فریق اِلزام دیتا ہے تو دُوسرا قطعی تردید کر دیتا ہے۔ آج سچ وہی کہہ سکتا ہے جِسے اپنی جان عزیز نہ ہو۔ معصوم اور بے گناہ لوگ بے موت مارے جا رہے ہیں۔''

حنا اور آس پاس کے سب ہی لوگ یہ ہولناک خبر سُنتے ہی سیما کے گھر کی جانب بھاگتے ہی گئے۔ سیما کے والدین' بہن بھائی اور دیگر رشتہ دار اُس سے میلوں

دُور تھے اور یہ اندوہناک خبر شاید ابھی اُن تک پہنچ بھی نہیں پائی تھی۔ مگر سیما کے گھر سے رونے کی آوازیں دُور دُور تک سُنائی دے رہی تھیں۔ رونے کی یہ آوازیں سیما کی ساس اور پانچ نندوں کی تھیں۔ گھر میں کہرام مچا تھا۔ عورتیں بال نوچ رہی تھیں، سینہ پیٹ پیٹ کر رو رہی تھیں اور چارپائی پر ایک میلے کچیلے کمبل کے نیچے سیما کی مڑی تڑی اور اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اُس کی مسکراتی خوبصورت آنکھیں یوں حیرت سے پھٹی پڑی تھیں جیسے اپنی موت کا اُسے خود بھی یقین نہیں آرہا ہو۔

''آہ! میری بہن! تمہارا یہ حشر کس نے کیا؟ راتوں رات تم پر ایک قیامت آکر گزر گئی اور مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔ میری بہن! تمہیں تو بھروسہ تھا کہ کوئی اِتنا بڑا اقدم نہیں اُٹھائے گا۔ تمہیں تو ناز تھا کہ تم معصوم بچے کی ماں ہو۔ تم اپنے دُکھ درد چھپانے والی تھیں۔ پھر یہ سب کیوں ہوا؟''

حنا اپنی ماموں زاد بہن کو یوں سب سے منہ موڑے بے بسی کی حالت میں پڑے دیکھ کر دہاڑیں مار مار کر روتی گئی۔ اُس کی آہ و پکار میں اور کتنی ہی عورتیں شامل ہوگئی تھیں۔ ''ہائے..........! وہ بہت ظالم تھے، بہت ظالم۔'' سیما کی ساس، جو بہو کی دردناک موت پر رو رو کر بے حال ہو چکی تھی، ذرا سنبھل کر واردات سے متعلق جانکاری دینے لگی تھیں۔

''ہائے..........! وہ چار لوگ تھے جو رات کے پہلے ہی پہر گھر میں داخل ہوئے۔ باہر پتہ نہیں کتنے تھے۔ اُن کے لمبے لمبے بال تھے۔ گورا رنگ تھا اُن کا۔ اُونچے لمبے قد کے تھے۔ اُن کے پاس ہتھیار تھے۔ اُنہوں نے ہم سب کو ایک کمرے میں اکٹھا کیا اور پوچھا۔ ''سیما کون ہے؟'' اوہ! سیما، میری جان، ہم تمہیں اب کہاں ڈُھونڈیں گے؟'' ساس تفصیل بتاتے بتاتے دُہائی دے کر رو پڑی تھیں۔ پاس بیٹھی بی بیوں نے اُنہیں سہارا دیا۔ ''صبر کرو بی بی! آپ کی بہو بے شک بہت اچھی تھی۔ کبھی دِکھائی نہیں پڑی۔ کبھی اُس کی آواز کانوں میں نہیں پڑی۔ پانچ سال اُس نے یہاں گزار دیئے

لیکن کبھی پتہ ہی نہیں چلا کہ اِس گھر میں بہو ہے یا نہیں۔ بس چُپ چاپ گھر کے کام کاج میں جُٹی رہتی تھی۔''

ساس سنبھلیں اور پھر بتانے لگیں ''اُنہوں نے بڑے کھر درے لہجے میں پھر پوچھا ''سیما کون ہے؟'' ہائے! میں منہ جلی کہنے ہی والی تھی کہ سیما میں ہوں۔ بتاؤ کیا کام ہے مجھ سے؟ مگر سیما خود ہی بول اُٹھی۔ وہ بچہ اُٹھائے ہوئے تھی۔ ''میں ہوں سیما' کیا بات ہے؟'' وہ بولے ''باہر چل کر ہماری بات سُنو۔'' ہم سبھی بول پڑے ''باہر کیوں لے جاتے ہو ہماری جوان بہو کو؟ باہر اندھیری رات ہے۔ یہیں پر بات کرو۔ ہائے......! مگر اُن ظالموں نے ہماری ایک نہ سُنی۔ اُس کے پاس سے بچہ چھین کر نیچے پٹخا اور بازو سے پکڑ گھسیٹتے باہر لے گئے۔ ہمیں بندوقیں دِکھا کر ایک ہی کمرے میں بند کر دیا۔ ہائے! ہم ساری رات تڑپتے رہے مگر ظالموں نے ہماری چاندسی بہو کو محض شک اور شکایت کی بنیاد پر ہی مار ڈالا۔ ہماری بہو جاسوسی نہیں کرتی تھی۔ ہماری بہو مخبری نہیں کرتی تھی۔ ہائے! وہ ظالم تھے۔'' ساس دہائی دیتے دیتے بے ہوش ہو جاتیں۔ اُن کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈال کر اُنہیں پھر سے ہوش میں لایا جاتا۔ یہی حال اُس کی نندوں کا بھی تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو حنا کو یوں لگا جیسے کہ سچ یہی ہو۔ سیما کی موت سچ مچ ہی ہتھیار بند لوگوں کے ہاتھوں ہوئی ہو۔

''مگر نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ سیما کی کوئی بھی بات مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میں اُس سے اُتنی ہی آگاہ تھی جتنی کہ خود اپنے آپ سے۔'' اُس نے اپنے خیالات کی خود ہی تردید کی۔

سیما کی اچانک اور بے رحمانہ موت پر ہر جانی انجانی آنکھ نم اور محوِ حیرت تھی۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں کے لئے سب سے بڑی حیرت یہ تھی کہ سیما جیسی چُپ چاپ لڑکی اندر سے کتنی ہوشیار تھی۔ آخر مارنے والوں نے یونہی تو نہیں مارا ہے۔ کچھ تو وجہ رہی ہوگی۔ غرض جتنے منہ اُتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ سرگوشیاں ہو رہی تھیں، تعجب و

حیرت کا اِظہار ہو رہا تھا۔ ''دیکھو جی، لوگ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں! آج کی عورتیں بھی کسی کام میں پیچھے کیوں رہیں۔ وہ بھی ہر میدان میں پیش پیش رہنا چاہتی ہیں۔''

''مگر لگتا نہیں ہے کہ سیما مخبری کرتی تھی۔ کسی نے غلط رپورٹ کی ہے۔''

''بھئی، کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ آرمی والے بھی تو اکثر اِس گھر میں آتے جاتے تھے۔ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر آ کر پورا دِن بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی پانی منگواتے تو کبھی چائے بنواتے۔''

''مگر آج کل آرمی والے کہاں نہیں ہیں اور کس گھر میں نہیں جاتے ہیں۔ اب حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ آرمی کہیں بھی اور کسی بھی وقت آ جا سکتی ہے۔ تلاشی لے سکتی ہے۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آرمی کے گھر میں آنے جانے سے کیا کوئی مخبر ہو سکتا ہے؟ مخبری کرنا تو چلتے پھرتے لوگوں کا کام ہے۔ سیما جیسی معصوم لڑکیاں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی ہیں۔ بے چاری ناحق ماردی گئی ہے۔''

غرض باتیں تھیں اور قیاس آرائیاں تھیں۔ ''اِس سے پہلے کیا کبھی آپ کو یا سیما کو کوئی دھمکی ملی تھی؟'' ایک معتبر عورت نے سیما کی ساس سے پوچھا۔

''ہاں! کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ دِن دِہاڑے ایک انجان آدمی گھر میں نمودار ہوا اور بڑے ہی ترش لہجے میں اُس نے کہا ''اپنی بہو کو کنٹرول میں رکھو۔'' بس وہ اِتنا ہی کہہ کر چلا گیا اور ہم ہکے بکے رہ گئے کہ اُس نے ایسا کیوں کہا؟''

سیما کی ساس کی یہ باتیں حنا کے کانوں تک پہنچ گئیں۔ اُس کے جی میں آیا کہ وہ اِس مکار عورت کی زبان کھینچ لے مگر اپنی کم ہمتی کے سبب وہ سوائے منہ ہی منہ میں بڑبڑانے کے اور کچھ بھی نہ کر سکی۔ ''بڑی بی! مجھے سب معلوم ہے۔ وہ کوئی اجنبی نہیں تھا۔ تمہارا دُور کا رِشتہ دار تھا اور اُس نے تمہیں اپنی بیٹیوں کو کنٹرول کرنے کے لئے کہا تھا جو ہرایرے غیرے کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں۔''

اب تو کتنی ہی عورتوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ واقعی سیما وہ نہیں تھی جو بظاہر لگتی تھی۔ پڑھی لکھی بھی تھی اور ایک فوجی کی بیوی بھی۔ کچھ نہ کچھ تھا، تبھی یہ سب کچھ ہوا ہے۔ ''ہاں بھئی۔ ہم کو کبھی کسی نے کوئی دھمکی نہیں دی۔ ہمیں کوئی مارنے نہیں آیا۔'' بس باتیں ہی باتیں تھیں۔

کہتے ہیں کہ پہلے پہر کے مرے ہوئے کو کوئی کتنی دیر روئے۔ ساس اور نندیں شاید رات بھر سے روتی آرہی تھیں۔ اب وہ نڈھال ہو کر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھیں اور پرائے لوگوں کو چاہے کتنا ہی دُکھ کیوں نہ ہو، وہ یوں تڑپ کر نہیں روتے ہیں جیسا کہ اپنے سگے رِشتہ دار اور بہن بھائی۔

حنا اب رونا پیٹنا چھوڑ کر گہری سوچوں میں ڈوب اور اُبھر رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ''میں زبان کھولوں یا بند رکھوں۔ کہیں میرا ابھی یہی حال نہ کر دیا جائے۔ اِن پرائے لوگوں میں میرا اپنا بھی کون ہے؟ ایک سیما ہی تو تھی لیکن اب وہ بھی نہیں رہی۔ میرے اور سیما کے امّی ابا پہنچیں تو پھر......''

اب سوائے باتوں کے، سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اب سیما کی لاش پر کوئی رو نہیں رہا تھا۔ وہ ایک لاوارث لاش کی طرح پڑی تھی۔ اُس کے چاہنے والے اُس سے کوسوں دُور تھے۔ پولیس پہنچ چکی تھی اور کاغذی کارروائی مکمل ہو رہی تھی۔ ''سیما کو کچھ بندوق برداروں نے گھر کے پچھواڑے میں کچھ دُوری پر لے جا کر گلا کاٹ کر ہلاک کیا تھا۔ اُسے پہلے دھمکی بھی دی گئی تھی۔ اُن کے بقول سیما کا آرمی والوں سے رابطہ تھا۔''

سیما کا شوہر بھی اُس سے کوسوں دُور اپنے وطن کی سرحدوں پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا کہ کوئی دُشمن اُس کے ملک کی سرحد میں داخل نہ ہونے پائے۔ مگر جان ہتھیلی پہ رکھ کر پہرہ دینے کے باوجود اُس کی بیوی اپنے شوہر کی جان کی سلامتی کی دُعائیں مانگتے ہوئے دہشت گردی کا شکار ہو گئی تھی۔

دِن ڈھلے سیما اور حنا کے والدین، بہن بھائی اور دیگر رِشتہ دار روتے بلکتے آن پہنچے، مگر اُن کی سیما اُن سے روٹھی پڑی تھی جیسے کہہ رہی ہو "اب آئے ہو؟ اب آئے ہو؟" اُنہوں نے کئی مہینوں سے اپنی سیما کو نہیں دیکھا تھا اور اب اُن کی سیما کفن پہنے اپنے آخری سفر کے لئے تیار تھی۔

وہ اُس سے لپٹ لپٹ کر روئے، دُہائیاں دے دے کر روئے۔ اُس کی پیاری پیاری باتیں یاد کر کے روئے۔ سیما کے سُسرالیوں نے اُنہیں سیما کی لاش سے ہٹا ہٹا کر اپنے گلے لگایا۔ رو رو کر اُس کی موت کی تفصیل بتائی اور پچھتائے کہ وہ سیما کی جگہ اپنی جان نہیں دے سکے۔ سیما کے والدین خون کے آنسو روئے اور پچھتائے کہ اُنہوں نے بیٹی کے گھر آنا جانا نہیں رکھا۔ اگر وہ آتے جاتے رہتے تو سارے حالات سے آگاہ رہتے۔ بیٹی اگر کسی غلط راہ چل پڑی تھی تو وہ اُسے سمجھا سکتے تھے۔ آج اُن کی بیٹی یوں جان سے تو نہ جاتی۔"

خود اُن کی بیٹی سال بھر میں صرف ایک آدھ بار میکے جاتی۔ چُپ چاپ رہتی۔ جانے شادی کے بعد سے اُسے کیوں چُپ لگ گئی تھی۔ وہ میکے میں کچھ دِن رہ کر خود ہی کہتی "میں گھر جاؤں گی۔" شادی کے موقعہ پر چیخ و پکار کرنے والی، شادی سے اِنکار کرنے اور خودکُشی کرنے تک کی دھمکیاں دینے والی اُن کی نادان سی بیٹی، سسرال میں قدم رکھتے ہی جیسے سمجھدار ہوگئی تھی۔ اُس کا الہڑ اور لااُبالی پن کہیں ختم ہوگیا تھا۔ کیونکہ سسرال والے اچھے تھے، شریف تھے۔ گُم صُم رہتے تھے۔ باتیں بہت کم کرتے تھے۔ اُونچی آواز میں نہیں بولتے تھے۔ اُنہوں نے بیٹی کا دِل جیت لیا تھا۔ لڑکا بھی سیدھا سادہ اور بھلا مانس تھا۔ اُن کی بیٹی سسرال میں پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا، گلہ نہ شکوہ۔ بیٹی کے گھر میں سکون تھا، آرام تھا مگر باہر کے ماحول میں سکون غارت تھا۔ دہشت، خوف اور ہراس کا عالم تھا۔ ہر کوئی اپنے سائے سے بھی ڈرتا تھا۔ فائرنگ، ہلاکتیں، تلاشی، پکڑ دھکڑ، یہاں وہاں سب جگہ جاری تھی۔ دہشت گردی

عروج پر تھی۔ آہ! نادان اور کم سن بیٹی، نا جانے کب اور کس کس کے بہکاوے میں آ گئی۔ لالچ میں آ گئی شاید اور جان گنوا بیٹھی۔ ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی۔ صرف سولہ سترہ برس کی ہی تھی وہ جب اُس کی شادی ہوئی تھی۔ دسویں پاس کی تھی۔ بھلے ہی اب بچے کی ماں تھی مگر خود بھی تو بچی ہی تھی نا۔ آہ! کتنی خوش نصیب تھی ہماری بیٹی، جس کو بھلا مانس بَر اور بھلا مانس گھر مِلا مگر زندگی نہ ملی۔ جیتی رہتی تو اِس گھر میں ہمیشہ سکھی رہتی۔ بے چارے سسرالیوں کا کیا حال ہوا جا رہا ہے۔ اُس کے غم میں نیم جان ہوئے جا رہے ہیں۔ سیما کے والدین نے دیکھا، جانچا پرکھا، خود بھی جی بھر کے روئے اور اپنی پیاری بیٹی کو سپردِ خاک کیا۔

مگر حنا ایک دوہرے صدمے سے دوچار، گہرے کرب میں مبتلا تھی۔ وہ کسی کامیاب اور فیصلہ کُن انجام پر پہنچنے کے لئے اپنے ذہن پر زور ڈال رہی تھی۔ اپنی ہمراز اور ماموں زاد بہن کا سوگ منانا وہ اب بھول چکی تھی۔ اُس کے ذہن میں سوچیں آتی اور جاتی نہیں تھیں بلکہ باہم ٹکراتی تھیں۔ اب وہ کیا کرے؟ چیخ چیخ کر کہہ دے کہ سچائی کیا ہے۔ مگر ایک اکیلی جان، وہ کیا کرے؟ کیا اُسے ایسا کہنے دیا جائے گا اور پھر یقین کون کرے گا۔؟ سیما تو بظاہر چُپ چاپ ایک اچھی زِندگی گزار رہی تھی۔ اری نادان سیما! کاش تُم نے خود ہی کچھ ماحول سازگار کیا ہوتا۔ کاش! تُو نے اپنے اُوپر ہونے والی زیادتیوں پر پردہ ڈالنے کے بجائے اُنہیں اُچھالا ہوتا۔ آج تمہیں نہ صرف بے موت مارا گیا ہے بلکہ طرح طرح کے اِلزام بھی تم پر لگائے جا رہے ہیں۔'' اُس نے سیما کو کوسا۔

حنا نے پہلے یہ سوچا تھا کہ وہ سیما کے میکے والوں کے آنے پر سچ اُگل دے گی مگر طویل اِنتظار کے بعد جب وہ روتے دھوتے اور بے سدھ ہوئے آئے تو سیما کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رو پڑے۔ اُس کی پُراسرار موت پر خدا کی خلقت پہلے ہی کہیں سے اُمڈی پڑی تھی۔ میکے والے جب پہنچے تو ہجوم میں اِس قدر اُبال آیا کہ گھنٹوں حنا اُن

تک پہنچ ہی نہیں پائی اور پھر اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سیما کے سسرال والے اُنہیں سیما سے ہٹا ہٹا کر اپنے گلے لگا رہے ہیں اور بری طرح رو رہے ہیں۔ ساس اور نندوں میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔ وہ دوبارہ سینہ پیٹنے اور بال نوچنے لگی تھیں۔ سیما کا سُسر اُس کے باپ کو گلے لگا کر بُری طرح رو پڑا تھا۔ ''آہ! میں جیتے جی مر گیا۔ میرے بیٹے کا گھر اُجڑ گیا۔ میرا معصوم پوتا بن ماں کے رہ گیا۔''

''اوہ! اب وہ کیا کرے۔'' حنا نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔

''کیا اب وہ سیما کے والدین کا' دیگر رشتے داروں کا اور سب کا بھرم توڑ دے' چکنا چور کر ڈالے۔ اپنے اور سیما کے سُسرال والوں کی نظر میں مجرم بن جائے اور پھر اپنی موت کے دِن گننے بیٹھ جائے' یا پھر اپنا گھر اُجاڑ دے۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا سیما کے والدین یہ نہ پوچھیں گے کہ تمہیں سب کچھ معلوم تھا تو تم نے پہلے کیوں نہ ہمیں خبر دی؟ تمہارے وسیلے سے ہی تو یہ تمہارے پڑوس میں بیاہی گئی تھی۔ اِس پردیس میں تم دونوں ہی تو ایک دُوسرے کا سہارا تھیں۔ تم اُس سے چند سال بڑی تھیں۔ تم نے آخر کیا مدد کی اُس کی؟ اُس پر ظلم ہوتا رہا' تمہیں سب معلوم بھی تھا اور تم نے ہمیں خبر نہ کی۔ کیا وہ تمہاری بہن نہ تھی؟ کیا تم ہماری بیٹی نہ تھیں؟''

''نہیں! اب مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ اگر میں منہ کھولوں گی تو میری آواز کی بازگشت صرف مجھے ہی سُنائی دے گی۔ میں ناحق اپنوں و بیگانوں کی نظروں میں مجرم بن جاؤں گی۔ شاید یہ سچ کسی اور طریقے سے ہی منکشف ہو جائے اور میری ساکھ بھی بنی رہے۔ آہ! میں بڑی کمزور دِل لڑکی ہوں۔ سوچتے سوچتے میں نے سارے مواقع گنوا دئے۔ پولیس کی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ سیما زمین میں سما چکی ہے۔ جب وہ ہی نہیں رہی تو اب کیا کہنا اور کیا سُننا؟'' حنا سوچوں میں غرق ہی تھی کہ تبھی ہجوم میں سے نکل کر سیما کی ماں نے اُسے گلے لگا لیا۔

''حنا' حنا بیٹی' کیا ہوا میری سیما کو؟ اُس نے کیا بھول کی؟ کیا تم نے اُس کی

کوئی بھول چوک دیکھی تھی؟''

''مامی جان! اب میں آپ کو کیا بتاؤں؟ بس یہی کہ سیما کو مار دیا گیا۔ اُس کی کوئی بھول چوک نہیں تھی۔ اُس کی بھول چوک بس یہی تھی کہ وہ ایک شریف اور عزت پسند لڑکی تھی۔'' وہ کتنی ہی دیر تک حنا کی ماں کے ساتھ لپٹی روتی رہی مگر اندر کا لاوا کسی طور اُگل نہ سکی اور پھر رونا اور سوچنا اُس کا معمول بن گیا۔

''آہ! میں کتنی احمق نکلی۔ میں کیوں نہ بتا سکی کہ سیما کو سسرال والوں نے اوّل روز سے ہی تنگ کر رکھا تھا کہ اُس نے پہلے اُن کے لڑکے کو ناپسند کرتے ہوئے شادی سے اِنکار کیوں کیا تھا۔ آہ! میں کیوں نہ بتا سکی کہ شادی کے دِن مہر کے معاملے کو لے کر ہوئی ناراضگی اور بحث کی وجہ سے اِن جاہل سسرال والوں نے اُسے ہمیشہ ستائے رکھا اور اب حکومت کی طرف سے ملنے والے ایک لاکھ روپے کی لالچ میں آ کر اِن ظالموں نے خود سیما کو قتل کیا اور اِلزام دہشت پسندوں کے سر تھوپ دیا۔ بھلے ہی ایسا کہنے سے میری اپنی زندگی خطرے میں پڑ جاتی، میرا اپنا گھر اُجڑ جاتا مگر اِن ظالم لوگوں کو کچھ تو سزا مل جاتی۔ نہیں! میں نے کچھ نہ بتلا کر اچھا کیا ہے۔''

اُس کا دھیان چند روز پہلے اخبار میں چھپی ایک خبر کی طرف چلا گیا کہ ایک آدمی قتل کے جُرم میں سات سال کی قید بھگت لینے کے بعد رِہا ہو کر گھر آیا اور دُوسرے ہی دِن ایک اور قتل کر دیا۔ ''ہاں، اِن ظالم لوگوں کو خدا ہی ہدایت دے۔ ہاں، میں نے خاموش رہ کر خود کو اور سیما کے والدین کو مزید دُکھی ہونے اور نت نئی اُلجھنوں میں مبتلا ہونے سے بچا لیا ہے۔ میں نے خاموش رہ کر دو خاندانوں کے درمیان پیدا ہونے والی دُشمنی کو ختم کر دیا ہے اور پھر سیما نے بھی تو حقیقت کو ہمیشہ ہی چھپائے رکھا۔ وہ اپنے سسرال والوں کے ظلم و ستم سہتی رہی اور دُوسرے لوگوں کو خبر تک نہیں ہونے دی۔ اُس نے تو کئی سالوں تک مجھے بھی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے بے خبر رکھا اور جب میں نے اُس کی غیر حالت بھانپ کر کرید کرید کے اُسے پوچھا تو اُس نے

اپنی صورتِ حال سے آگاہ کر کے مجھے سختی سے تاکید کی کہ میں کسی اور سے اُن باتوں کا ذِکر نہ کروں اور آخری بار بھی تو وہ مجھے یہی کہہ کر گھر گئی تھی کہ میں ساری باتیں اپنے دِل میں ہی رکھوں۔ اپنے پرائے کسی سے بھی اُس کے سسرال والوں کی زیادتیوں کا ذِکر نہ کروں۔ ہاں، مگر وہ بے چاری بھی کیا کرتی؟ ایسا تو وہ صرف سسرال والوں کے ڈر سے ہی کہتی تھی کہ وہ اُسے مزید تنگ نہ کریں۔ گھر کی باتیں باہر بتلانے کی سزا الگ سے نہ دے ڈالیں۔'' حنا کو اُس کی وہ باتیں یاد آنے لگیں جب ایک بار اُس نے اُسے غصّے سے اور سمجھاتے ہوئے کہا تھا ''سیما! پاگل مت بنو۔ تم اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ذِکر اپنے میکے والوں سے کیوں نہیں کرتی ہو؟''

تو جواب میں سیما نے کہا تھا ''آپی! میں اپنے ماں باپ کو مزید دُکھی نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ابا بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ امّاں بھی ہر وقت بیمار رہتی ہیں۔ اُدھر صبا باجی پہلے سے ہی طلاق پا کر ابا کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ کہیں میرا انجام بھی ایسا ہی ہو جائے تو! بھلا ایک ہی گھر میں دو دو طلاق شُدہ بیٹیاں! لوگ ہمارے بارے میں کیا کہیں گے؟'' حنا کو اُس کی سمجھداری اور مجبوری کا قائل ہونا ہی پڑا تھا۔

''بے شک وہ صابر و شاکر رہنے والی تھی۔ وہ گھر کے، ساس نندوں کے جھگڑوں کو طول دینے کے بجائے معمولی جان کر برداشت کر لیتی تھی۔ بے شک وہ مصالحت آمیز رویّہ کی حامل تھی۔'' حنا برابر اُس کی یادوں اور سوچوں میں کھوئی تھی۔ ''میں جب جب بھی اُسے اُکساتی کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر ہنسنے کے بجائے اُن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے، تو وہ ہنس کر کہتی ''آخر کب تک مجھے تنگ کریں گے؟ نندیں کبھی نہ کبھی تو بیاہی ہی جائیں گی۔ دیور بھی شادیاں کر لیں گے۔ جب نئی بہوئیں گھر میں آئیں گی، تب تو اُنہیں پتہ چل جائے گا نا کہ میں کتنی بُری ہوں۔ مجھے ستانے والے ساس، سُسر بھی تو آخر بوڑھے ہوں گے نا؟''

''ہاں! سیما اچھے مستقبل کی خواہش میں سارے دُکھ سہے جا رہی تھی۔ زِندہ

رہتی تو وہی کامیاب گردانی جاتی، مگر ظالموں نے اُسے جیتے جی مار ڈالا۔ گھر کے پچھواڑے تک اُسے کیسے لے گئے ہوں گے۔ کسی بہانے سے، یا پھر منہ اور ہاتھ پیر باندھ کر، ظالموں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی سیما نے اپنے بیٹے کے بارے میں کیا سوچا ہوگا، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو تو یاد کیا ہوگا کہ اِس وقت اُس کے اپنے سب کہاں ہیں اور یہاں اکیلے میں اُس کو کس بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔ جیتے جی اپنے گلے پر چھری کے عذاب کو سہا ہوگا اور پھر نا جانے کتنی دیر تک تڑپ تڑپ کر اُس نے جان دی ہوگی۔''

حنا تصوّر میں سیما کا تڑپتا وجود دیکھ کر بلند آواز میں پھوٹ پھوٹ کر اُس وقت اچانک رو پڑی جب گھر اور باہر کے سبھی لوگ چُپ چاپ خاموشی سے بیٹھے تھے۔ اُس روز سیما کے سسرال والے چوتھے کی رسم کی تیاریوں میں جُٹے تھے۔ سیما کے میکے سے آنے والے اُس کے سبھی رِشتہ دار دُوسرے ہی دِن صبح سویرے واپس جا چکے تھے۔ مگر اُس کے ماں باپ دونوں ہی وہیں رُکے رہے اور سیما کے بیٹے کو اُس کی نشانی کے طور پر سنبھالے ہوئے تھے۔ اُس کا دِل بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے مگر وہ وقفے وقفے سے اپنی توتلی زبان میں پوچھتا ''مما کہاں ہے؟'' اور پھر رونے لگتا۔

اُس کا چھوٹا چچا اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ اُس کا خیال رکھ رہا تھا اور جب بچہ مما مما کر کے رونے لگتا تو اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو اُتر آتے جنہیں وہ جلدی سے پونچھ ڈالتا۔ یہ بات سیما کے والدین نے بھی محسوس کی کہ اُس لڑکے کو اپنی بھابی کی موت کا کہیں زیادہ دُکھ ہوا ہے۔ وہ صرف بچے کو اُٹھائے پھرتا بلکہ گھر والوں سے بھی بات نہیں کرتا اور نہ ہی کام میں اُن کی مدد کرتا اور یہ بات حنا نے بھی محسوس کی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ سارے گھر میں صرف یہی لڑکا تھا جو سیما سے ضِد اور لڑائی جھگڑا نہیں کرتا تھا اور بسا اوقات اُس کی ہمدردی میں بھی بول جایا کرتا تھا۔ حنا نے سوچا کہ موقع پا کر میں اِس لڑکے سے پوچھوں گی کہ واردات والے دِن وہ کہاں تھا، گھر میں یا کہیں

باہر گیا ہوا تھا؟ حنا کا تو اندازہ یہی تھا کہ اُس دِن اُسے کہیں بھیج دیا گیا ہوگا۔ اگر وہ گھر میں ہی رہا تھا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتلائے گا کہ سیما کے ساتھ کیا معاملہ رہا؟ اُسے کیسے مارا گیا؟ اُس کی باتوں سے کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ہاتھ لگ جائے گا اور اگر یہ لڑکا اُس دِن گھر میں ہی ہوا اور اُس نے بھی مجھے یہی بیان دیا کہ سیما کو دہشت پسندوں نے ہی مارا ہے، تو پھر!" حنا ایک اور سوچ میں پڑ گئی۔

"ممکن ہے سیما کو دہشت پسندوں نے ہی مارا ہو! مگر کیوں؟" ایک سوال پھر سے اُس کے ذہن میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ضرور اِنہی سسرال والوں نے سیما کے بارے میں غلط رپورٹ پہنچا کر اُسے اُن سے قتل کروایا ہے۔ اُنہیں اِس بات کی یقین دہانی کرائی ہوگی کہ یہ مخبری کرتی ہے یا پھر کردار کی اچھی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو بھی سسرال والے ہی سیما کے قاتل ہیں۔ اُس کے بارے میں جھوٹی اور من گھڑت اِطلاعات فراہم کر کے ہی اُنہوں نے اُسے قتل کروایا ہوگا۔ ورنہ سیما کے کردار سے تو میں اُتنی ہی واقف ہوں جتنی کہ خود اپنے آپ سے۔ وہ سیدھی سادی لڑکی، جس کا چہرہ ہی معصوم دِکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ جس کا دِل بھی معصوم تھا۔ اپنی شادی پر خوش نہیں تھی تو اُس نے کھلے دِل سے اِظہار کر دیا۔ ماں باپ نے ڈرایا، دھمکایا، بڑی بہنوں نے سمجھایا بجھایا تو اُس نے خاموشی اِختیار کر لی۔ شادی کے بعد سسرال والوں نے ستانا شروع کیا تو اُسے اور بھی چُپ لگ گئی۔ اُس سے تو اِتنا نہ ہو سکا کہ سسرال والوں کے ظلم وستم کے خلاف والدین سے شکایت کرتی۔ اُن کے ظلم وستم کو جواز بنا کر اپنی ناپسندیدہ شادی سے جان ہی چھڑا لیتی۔ وہ صابر و شاکر بنی، ہر ظلم وستم سہتی رہی اور پھر وہ بے داغ لڑکی آخر میرے ہی خاندان کی جنمی اور پلی بڑھی تھی۔ میرے ہی خاندان کا خون اُس کی رگوں میں بھی تھا۔ وہ کیونکر کوئی ایسا غلط کام کرتی؟ جہاں تک مجھے علم ہے، ہمارے خاندان کی عورتوں نے ہی نہیں بلکہ مردوں نے بھی اپنے کردار کو بے داغ رکھا ہے اور سیما کے تو پل پل کی مجھے خبر رہی ہے۔ اُس کا کردار تو آئینہ رہا ہے۔ اُس کے سسرال

والے اُس کے مخبری اور جاسوسی کرنے کے اِلزام میں مارے جانے کی باتیں کرتے ہیں مگر میں یہ سب کیسے مان لوں کہ ایک سیدھی سادی لڑکی جو اپنے گھریلو مسائل سے ہر وقت پریشان حال تھی، جو اپنے بچے کی توتلی زبان کی باتوں پر روتے روتے ہنس جایا کرتی تھی، وہ اِتنا بڑا اور سنگین قدم اُٹھا سکتی تھی۔'' سوچوں ہی سوچوں میں حنا نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

چہارم کی دُعا کے بعد سب گھر والے اور کچھ پڑوس کے لوگ فارغ ہو کر بیٹھے۔ سیما کی ماں اُس کے بچپن کی باتیں یاد کر کے آنسو پونچھنے لگیں۔ اُس کے ابّا کسی گہری سوچ میں ڈُوبے ہوئے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے آہ بھر لیتے۔ اُس رات حنا بھی وہیں ٹھہر گئی تھی۔ اُس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُن لوگوں کے گھر میں رہے اور اُن کی مکروہ شکلیں دیکھے مگر سیما کی ماں کے اِصرار پر وہ وہیں ٹھہر گئی۔ اُس نے دیکھا کہ گھر والوں کے چہروں پر سوگواری کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر چہ سیما کی نندیں اور دیور سر جھکائے اور بال بکھرائے ہوئے تھکے ماندے اِدھر اُدھر چل رہے تھے مگر اُن سب کے چہروں پر کرب کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ ایک طرح سے وہ فتح مند نظر آ رہے تھے اور فتح مندی یہ تھی کہ سیما کے قتل پر دہشت گردی کا پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جب کہ گاؤں بھر کے دیگر لوگ اِس حادثے پر دہشت سے بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ دبی دبی زبان میں دہشت پسندی کو کوس رہے تھے مگر مارے ڈر کے کھلم کھلا کوئی کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا اور کوئی کہتا بھی کیا۔ دہشت گردی عروج پر تھی۔ فوجی پکڑ دھکڑ اور تلاشیاں جاری تھیں۔ قرب و جوار کے کتنے ہی نوجوان دہشت گردی کے شبے میں یا ملوث ہونے کے اِلزام میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح کتنے ہی گھر مخبری کے شبے یا اِلزام میں ویران ہو چکے تھے مگر ——

''سیما......... سیما....... سیما اپنے ظالم اور لالچی سسرال والوں کی بھینٹ چڑھی تھی۔'' حنا نے دِل ہی دِل میں وثوق سے کہا۔ ''جس پر دہشت گردی کا لیبل چپکا

باہر گیا ہوا تھا؟ حنا کا تو اندازہ یہی تھا کہ اُس دِن اُسے کہیں بھیج دیا گیا ہوگا۔ اگر وہ گھر میں ہی رہا تھا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتلائے گا کہ سیما کے ساتھ کیا معاملہ رہا؟ اُسے کیسے مارا گیا؟ اُس کی باتوں سے کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ہاتھ لگ جائے گا اور اگر یہ لڑکا اُس دِن گھر میں ہی ہوا اور اُس نے بھی مجھے یہی بیان دیا کہ سیما کو دہشت پسندوں نے ہی مارا ہے، تو پھر!'' حنا ایک اور سوچ میں پڑ گئی۔

''ممکن ہے سیما کو دہشت پسندوں نے ہی مارا ہو! مگر کیوں؟'' ایک سوال پھر سے اُس کے ذہن میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''ضرور اِنہی سسرال والوں نے سیما کے بارے میں غلط رپورٹ پہنچا کر اُسے اُن سے قتل کروایا ہے۔ اُنہیں اِس بات کی یقین دہانی کرائی ہوگی کہ یہ مخبری کرتی ہے یا پھر کردار کی اچھی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو بھی سسرال والے ہی سیما کے قاتل ہیں۔ اُس کے بارے میں جھوٹی اور من گھڑت اِطلاعات فراہم کر کے ہی اُنہوں نے اُسے قتل کروایا ہوگا۔ ورنہ سیما کے کردار سے تو میں اُتنی ہی واقف ہوں جتنی کہ خود اپنے آپ سے۔ وہ سیدھی سادی لڑکی، جس کا چہرہ ہی معصوم دِکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ جس کا دِل بھی معصوم تھا۔ اپنی شادی پر خوش نہیں تھی تو اُس نے کھلے دِل سے اِظہار کر دیا۔ ماں باپ نے ڈرایا، دھمکایا، بڑی بہنوں نے سمجھایا بجھایا تو اُس نے خاموشی اِختیار کر لی۔ شادی کے بعد سسرال والوں نے ستانا شروع کیا تو اُسے اور بھی چُپ لگ گئی۔ اُس سے تو اِتنا نہ ہو سکا کہ سسرال والوں کے ظلم وستم کے خلاف والدین سے شکایت کرتی۔ اُن کے ظلم وستم کو جواز بنا کر اپنی ناپسندیدہ شادی سے جان ہی چھڑا لیتی۔ وہ صابر وشاکر بنی، ہر ظلم وستم سہتی رہی اور پھر وہ بے داغ لڑکی آخر میرے ہی خاندان کی جنمی اور پلی بڑھی تھی۔ میرے ہی خاندان کا خون اُس کی رگوں میں بھی تھا۔ وہ کیونکر کوئی ایسا غلط کام کرتی؟ جہاں تک مجھے علم ہے، ہمارے خاندان کی عورتوں نے ہی نہیں بلکہ مردوں نے بھی اپنے کردار کو بے داغ رکھا ہے اور سیما کے تو پل پل کی مجھے خبر رہی ہے۔ اُس کا کردار تو آئینہ رہا ہے۔ اُس کے سسرال

والے اُس کے مخبری اور جاسوسی کرنے کے اِلزام میں مارے جانے کی باتیں کرتے ہیں مگر میں یہ سب کیسے مان لوں کہ ایک سیدھی سادی لڑکی جو اپنے گھریلو مسائل سے ہر وقت پریشان حال تھی، جو اپنے بچے کی توتلی زبان کی باتوں پر روتے روتے ہنس جایا کرتی تھی، وہ اِتنا بڑا اور سنگین قدم اُٹھا سکتی تھی۔'' سوچوں ہی سوچوں میں حنا نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

چہارم کی دُعا کے بعد سب گھر والے اور کچھ پڑوس کے لوگ فارغ ہو کر بیٹھے۔ سیما کی ماں اُس کے بچپن کی باتیں یاد کر کے آنسو پونچھنے لگیں۔ اُس کے ابا کسی گہری سوچ میں ڈُوبے ہوئے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے آہ بھر لیتے۔ اُس رات حنا بھی وہیں ٹھہر گئی تھی۔ اُس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُن لوگوں کے گھر میں رہے اور اُن کی مکروہ شکلیں دیکھے مگر سیما کی ماں کے اِصرار پر وہ وہیں ٹھہر گئی۔ اُس نے دیکھا کہ گھر والوں کے چہروں پر سوگواری کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی۔ اگر چہ سیما کی نندیں اور دیور سر جھکائے اور بال بکھرائے ہوئے تھکے ماندے اِدھر اُدھر چل رہے تھے مگر اُن سب کے چہروں پر کرب کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی بلکہ ایک طرح سے وہ فتح مند نظر آرہے تھے اور فتح مندی یہ تھی کہ سیما کے قتل پر دہشت گردی کا پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جب کہ گاؤں بھر کے دیگر لوگ اِس حادثے پر دہشت سے بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ دبی دبی زبان میں دہشت پسندی کو کوس رہے تھے مگر مارے ڈر کے کھلم کھلا کوئی کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا اور کوئی کہتا بھی کیا۔ دہشت گردی عروج پر تھی۔ فوجی پکڑ دھکڑ اور تلاشیاں جاری تھیں۔ قرب وجوار کے کتنے ہی نوجوان دہشت گردی کے شبے میں یا ملوث ہونے کے اِلزام میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکے تھے۔ اِسی طرح کتنے ہی گھر مخبری کے شبے یا اِلزام میں ویران ہو چکے تھے مگر ——

''سیما......... سیما....... سیما اپنے ظالم اور لالچی سسرال والوں کی بھینٹ چڑھی تھی۔'' حنا نے دِل ہی دِل میں وثوق سے کہا۔ ''جس پر دہشت گردی کا لیبل چپکا

دیا گیا ہے اور میں احمق، بُزدل چپ چاپ یہ ناٹک دیکھتی رہی۔'' حنا نے خود کو بُری طرح کوسا۔ سیما کی دردناک موت اُس کے رِشتہ داروں کے لئے ایک ایسا سانحہ تھا جسے بھُلایا نہیں جا سکتا تھا مگر حنا کے لئے یہ صرف سانحہ ہی نہیں بلکہ ایک بھاری بوجھ اور ایک رِستا زخم تھا۔ سیما مر چکی تھی۔ اُس کا پیارا سا بچہ بِن ماں کے رہ گیا تھا۔ سیما تو اپنے بچے کو ایک پل بھی اپنے سے علیٰحدہ نہیں کرتی تھی۔ وہ اُس کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور معصوم حرکتوں کو بیسیوں بار دُہراتی اور خوش ہوتی تھی۔ اُس کے سنہرے مستقبل کے خواب دیکھتی تھی۔ اب اُس کا بچہ اُنہی لوگوں کے پاس رہ رہا تھا جنہوں نے اُس کی ماں کی جان لے لی تھی۔

سیما کی موت کو مہینوں گزر گئے مگر حنا کے سر سے بوجھ نہ اُترا۔ کبھی تو وہ خود کو قصوروار گردانتی تو کبھی سیما کو، جو ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کرتے ہوئے بظاہر ساس سسر کے گھر میں پُرسکون زِندگی گزار رہی تھی اور کبھی خود کی سراہنا کرتی۔

''میں نے اچھا کیا جو اپنی زبان بند رکھی۔ اگر میں یہ کہے دیتی کہ سیما کو اُس کے سسرال والوں نے مارا ہے تو میں کہیں کی بھی نہ رہتی۔ میری بات پر بھلا کوئی یقین ہی کیسے کرتا؟ سیما تو نہ صرف اپنے والدین کی نظروں میں بلکہ اڑوس پڑوس والوں کی نظر میں بھی ایک خوشحال زندگی جی رہی تھی۔ اگر میں کچھ کہے دیتی تو اُلٹا دھر لی جاتی۔ اپنے بیگانے، سب ہی میرے دُشمن ہو جاتے۔'' مگر ایسا سوچ کر بھی حنا کے سر سے بوجھ نہ اُترا۔ وہ معصوم سیما کو بھول نہ پائی۔ ''تو اب کیا کروں.....؟''

بہت کچھ سوچ لینے کے بعد اُسے سیما کی شادی سے لے کر موت تک کی آپ بیتی لکھنے کا خیال سوجھا۔ شاید اِس طرح اپنے دِل و دماغ پر پڑا بوجھ اور غم کچھ ہلکا ہو سکے اور مزید یہ کہ آئندہ شاید کوئی اور سیما یوں بے موت مارے جانے سے بچ جائے۔ اُس نے ایک نئے اور مُصمّم اِرادے سے کاغذ و قلم تھام لیا۔

○○○

سردیوں کی پہلی بارش ہوئی تھی مگر ایک طویل انتظار کے بعد —— بار ہا ایسا ہوا کہ موسم نے بارش برسانے کا ماحول بنایا مگر زور زور کی ہوائیں چلیں اور بن برسے ہی موسم صاف ہوگیا۔

مگر اب کے گزشتہ تین دِنوں سے آسمان میں جو بادل منڈلا رہے تھے، اُن سے ہر شخص پُر اُمید تھا اور دُعا گو بھی۔

رات بھر خنک ہواؤں کی سرسراہٹ جاری رہی تھی اور اِس خوشی میں کہ آج رات کچھ نہ کچھ بارش ضرور ہوئی ہے، صائمہ بی بی صبح گھنٹہ بھر پہلے ہی بستر سے نکل پڑی اور دُعائے خیر کے ساتھ گھر کا دروازہ کھولا۔ سامنے کے کھیتوں میں دُور دُور تک گھپ اندھیرا تھا مگر برآمدے میں جاگ رہے بلب کی روشنی میں گھر کا آنگن تر بتر تھا اور مزید پھوار کی کرنیں بلب کی روشنی میں ستاروں کی طرح جھلمل کر رہی تھیں۔ آج بلب بھی ایک دم سے زِندہ ہوگیا تھا۔ سب کچھ زِندہ ہوگیا تھا اور وہ خود بھی۔ ایک دم سے دروازہ کھولنے کے ساتھ محسوس ہونے والی سرد ہوائیں آج اُسے ناگوار نہیں لگی تھیں بلکہ بارش میں نہائی ہوئی اُن سرد ہواؤں سے اُس کی رُوح تک سرشار ہوگئی تھی۔

بارش کے اِستقبال میں اُس نے سب سے پہلے انگیٹھی دہکانے کا اہتمام کرنا مناسب سمجھا اور پھر رسوئی میں جا کر گیس پر چائے چڑھا دی۔ میاں کے کمرے میں اُس نے چائے کی کیٹلی اِس خوشخبری کے ساتھ رکھی کہ آج بارش ہوئی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔

اپنی چائے پیالی میں ڈال کر وہ پھر سے باہر برآمدے میں آکر دہکتے کوئلوں کے پاس بیٹھ کر بارش کا نظارہ کرنے لگی۔ اب اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ زمین اور آسمان کی حدیں واضح ہو چکی تھیں۔ ہوائیں اور فضائیں راتوں رات دُھل کر پاک و صاف ہو گئی تھیں۔ صائمہ بی بی نے کھلی کھلی سانسیں لیں۔

''اب سانسیں بوجھل نہیں رہی ہیں۔'' اُس نے محسوس کیا ''اور کل تک......''

وہ سوچنے لگی۔ ''کل تک راہ میں چلتے ہوئے گھٹنوں تک دُھول اور مٹی چڑھ جاتی تھی۔ ہوا اِس قدر گرد آلود تھی کہ سانس لینے میں بوجھل پن اور دِقت کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اب کے یہ ویران کھیت ہر جاندار کے لئے غذا جٹانے میں مصروف ہو جائیں گے۔ کون کسی کے دیئے پہ جیتا ہے۔ دینے والا تو اللہ ہے جو اپنی مخلوق کو بارش دے کر، صاف و ستھری ہوا دے کر، روزی دے کر اور الگ الگ موسم دے کر زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ہر موسم میں ایک خوشگواریت ہوتی ہے۔ ہر موسم ایک الگ مزہ اور تازگی دیتا ہے مگر کوئی اِس تازگی اور خوشگواریت کو پہچانے اور محسوس کرے تب نا! جیسے آج میں اِس موسم سے لطف اندوز ہو رہی ہوں، کیا کوئی اور بھی ہو رہا ہوگا؟ شاید کوئی بھی نہیں اور شاید سب ہی۔ شاید سب سے بڑی بے حس اور بے خبر میں ہی ہوں۔''

اپنے اِس آخری خیال پر وہ خود ہی ذرا سی ہنس دی اور چائے کی پیالی اُٹھالی۔ دہکتی انگیٹھی کو اپنے پاس اور ذرا سا سرکا لیا۔ بھاپ اُٹھتی گرم گرم چائے سے اُس نے موٹے موٹے گھونٹ بھرنے شروع کئے۔ اب اُس کی سانسوں سے بھی زوروں کی بھاپ نکلنے لگی تھی۔ ''یہ بھی تو ایک موسم ہے۔ ہر موسم میں منہ سے بھاپ نہیں نکلتی ہے۔''

وہ پھر سے موسم کے متعلق سوچتے ہوئے گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرنے لگی مگر ابھی اُس نے چند ہی گھونٹ بھرے تھے کہ ایک منفرد سے درد بھرے احساس نے آناً فاناً ہی اُسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ آرام اور سکون کی گھڑیوں میں صائمہ بی بی

اکثر اِس درد بھرے احساس سے دو چار ہو جاتی تھی۔

''آہ! گھر میں ایک بزرگ ہستی ہو جس کے لئے وہ یونہی صبح صبح اُٹھے۔ جلدی جلدی چائے بنائے اور پھر پیالی میں ڈال کر گرم گرم بھاپ اُٹھتی چائے، بڑے خلوص اور احترام کے ساتھ اُسے پیش کرے۔''

اِس دُکھ بھرے احساس نے کہیں غیر محسوس طریقے سے اُس کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی نیچے فرش پر رکھوادی۔ ''اور جب اِس گھر میں ایک بزرگ ہستی کا وجود موجود تھا تو تب! تب.....!'' بس اِس سے آگے سوچنے سے اُس کی طبیعت مزید بوجھل اور مضمحل ہونے لگتی تھی۔ مگر یادیں کب پیچھا چھوڑتی ہیں۔ اچھی ہوں یا بُری۔

''وہ ایسا ہی سردیوں کا موسم ہے اور بابا پڑوس میں رہنے والے ایک ادھیڑ عمر آدمی سے شکایت کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ بھئی! میں صبح سویرے چائے پینے والا آدمی ہوں مگر مجھے صبح کی چائے ملتی ہے کوئی نو دس بجے۔''

اب جب پورے گھر میں کھانا و چائے بنانے اور پلانے والی ایک ہی ہو تو ظاہر ہے یہ شکایت اُسی کے خلاف تھی۔ صائمہ بی بی بابا کی اِس شکایت کو بے جا گردانتے ہوئے جل بھُن کر دِل میں بڑ بڑا اُٹھتی ہے۔ ''ہنھ! پتہ نہیں کون پلاتا تھا صبح سویرے چائے۔ نوکر تو کبھی اِس گھر میں ہوئے نہیں اور ساس اماں لکڑی، پانی جٹانے جیسے دسیوں کام لیتی تھی آپ سے۔ ہم سب صبح کی چائے و ناشتہ کھا پی لیتے تو تب آپ کی باری آیا کرتی تھی۔ ساس اماں کے سامنے تو بھیگی بلّی بنے رہتے تھے، جیسے منہ میں زبان نہ ہو اور آج لوگوں سے بڑی بڑی باتیں کرتے پھرتے ہیں اور میری شکایتیں!''

اُس بار بابا کی صحت اچھی نہیں تھی۔ وہ زکام اور بخار میں مبتلا تھے اور بستر پر ہی تھے۔ صائمہ بی بی گھر کے کام کاج میں مصروف اندر باہر چل پھر رہی تھی۔ بابا نے کچھ کرخت آواز میں اُسے پکارا اور ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا ''صبح سے یہ جوٹھے برتن میرے پاس پڑے ہیں۔ تم نے اُٹھائے نہیں۔''

صائمہ نے برتن تو جھٹ سے اُٹھائے مگر دِل ہی دِل میں کتنی ہی کھری کھوٹی بابا کو سُناڈالیں اور میاں سے شکایت بھی کر ڈالی۔"بابا کچھ زیادہ ہی بنتے ہیں۔کیا ہوا جو صبح کے چند جھوٹے برتن پاس پڑے رہے۔میں دوپہر کا کھانا دیتے وقت صبح کے برتن سمیٹ لیتی مگر بابا نے تو آسمان سر پہ اُٹھالیا۔بابا خود کو کچھ زیادہ ہی سمجھنے لگے ہیں۔ایسی ایسی باتیں منوانے لگ جاتے ہیں جو کبھی ساس اماں نے بھی نہ مانی ہوں۔ہنھ!"

صبح کے دس بجنے کو ہیں اور بابا برآمدے میں بیٹھے صبح کا ناشتہ اور چائے نوش فرمارہے ہیں۔پڑوس کے ایک آدمی نے قریب سے گزرتے ہوئے پوچھ لیا۔"بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے کھانے پینے کا؟"

بابا نے پہلو بدلا اور جواب میں کہا"بھئی!امیر کو جب بھوک لگے اور غریب ومسکین کو جب بھی ملے!"جب سے بابا کی بیوی کا اِنتقال ہوا تھا وہ خود کو غریب ومسکین ہی کہلوانا پسند کرنے لگے تھے۔

بابا نے جواب تو بہت معقول دیا تھا۔پڑوسی بابا کا یہ جواب سُن کر مُسکرادیا تھا مگر صائمہ بی بی کو بابا کا یہ جواب بہت ناگوار گزرا۔وہ جھٹ سے بول پڑی"اللہ رے!بابا آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ صبح سے آس پاس کے دس گھروں میں گھوم پھر کر ابھی لوٹا ہوں۔خود تو گھر میں ٹکتے نہیں ہیں اور اِلزام ہمیں دئے جاتے ہیں۔"

بابا دیگر کئی بوڑھوں سے بہت اچھے تھے۔گالیاں نہیں کے برابر دیتے تھے اور جب اچھے موڈ میں ہوتے تو ڈھیروں دُعائیں بھی دے جاتے تھے۔کام بھلے ہی رائی برابر نہیں کر پاتے تھے مگر باتیں اور خاص طور پر بہو بیٹے کی شکایتیں زوردار انداز میں کرتے ہی رہتے تھے۔بیٹا تو بابا کی باتوں اور شکایتوں کا ذرا بھی بُرا نہیں مناتا تھا۔اُس کا کہنا تھا کہ یہ عُمر ہوتی ہی ایسی ہے۔اپنے بس میں کچھ نہیں ہوتا ہے مگر صائمہ بی بی بابا کی شکایتوں پر جلتی اور کڑھتی رہتی اور کبھی کبھار ٹوکا ٹا کی بھی کر دیتی۔

کچھ دِنوں سے بابا گھر میں ہر آنے جانے والے سے گلاب بانو کی تعریفیں

کرر ہے تھے۔ ''میرے کپڑے میلے ہوئے تھے۔ میں دھونے کے لئے دریا پر جارہا تھا۔ راستے میں گلاب بانو مل گئی۔ اُس نے مجھ سے کپڑے چھین لئے۔ کہنے لگی '' آپ اِس عمر میں خود کپڑے دھونے جا رہے ہیں۔ بیوی مری ہے، بہوئیں تو زِندہ ہیں آپ کی۔ میں خود دھو کر آپ کے گھر پہنچا دُوں گی۔''

بار بار کی اِس جانکاری نے صائمہ کو دُکھی کر دیا۔ ایک روز وہ بول ہی پڑی ''بابا لوگوں کو دِکھانے کے لئے خود کپڑے دھونے چل پڑتے ہیں۔ آج نہیں تو کل میں خود دھوئے دیتی۔ گٹھڑی باندھ کر بغل میں دبا کر گرتے سنبھلتے دریا پر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ گھر میں بھی تو دھوئے جا سکتے تھے۔ صرف یہی نا کہ لوگ دیکھیں اور جانیں کہ بہو کپڑے دھو کر نہیں دیتی ہے۔ بابا تو جان بوجھ کر ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے ہم پر حرف آئے۔''

غرض یہ کہ جب تک بابا زندہ رہے، کھٹ پٹ بھی ہوتی رہی۔ صائمہ بی بی کو بابا کی یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں کہ کپڑے دھونے، کھانے پینے یا دوائی وغیرہ لانے میں کہیں دیر سویر ہو جائے تو بابا عام لوگوں سے بہو بیٹے کی شکایتیں کرنا شروع کر دیں۔

بیوی کے چل بسنے کے بعد بابا بیس سال تک جیتے رہے۔ تین دِنوں سے وہ کہہ رہے تھے ''میری صحت ٹھیک نہیں ہے۔'' بظاہر ہانپتے کانپتے چل پھر بھی رہے تھے۔ اِس لئے کسی کو بھی اُن کی صحت کی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ اُس شام اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ میری صحت ٹھیک نہیں ہے، کھانا کھانے سے بالکل اِنکار کر دیا۔

''ہم صبح ہوتے ہی آپ کو ہسپتال لے چلیں گے۔''

اُنہیں یقین دِلایا گیا۔ اِس یقین دہانی کے جواب میں بابا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر ہاتھ سے جو اِشارہ کیا، اُس کا مفہوم بس یہی نکلتا تھا۔

''ارے! کون جیتا ہے صبح ہونے تک؟''

اور پھر رات کے دو بجے صائمہ بی بی کو اس آواز پر کہ ''بابا کو کچھ ہو گیا ہے،'' گہری نیند سے ہڑ بڑا کر اُٹھنا پڑا۔ ''یا اللہ ہمارے بابا کو زندگی بخشنا۔'' اُس نے دِل کی گہرائیوں سے دُعا مانگی اور ہڑ بڑاہٹ میں بِنا بلب جگائے' اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر گرتے پڑتے جب وہ بابا کے کمرے میں اُن کے سرہانے جا کھڑی ہوئی تو دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ بابا اپنے بستر پر بغیر تکیہ اور بغیر کمبل داہنی طرف منہ موڑے چت پڑے تھے۔ اُن کا منہ اور پاٹو کے انگوٹھے اُنہی کے گلے میں پڑے رہنے والے گلوبند سے باندھے جا چکے تھے۔

صائمہ بی بی بُری طرح تڑپ اُٹھی۔

''بس بابا! بس! اِتنا ہی دم تھا۔ یوں چپکے سے چل دیئے۔ کچھ دن تو اور جیے ہوتے۔ کچھ اطلاع تو دیئے جاتے۔ خدا گواہ ہے ہم نے ابھی خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ ہم تو آج صبح سویرے آپ کو ہسپتال لے جانے والے تھے۔ آپ کو اِتنی جلدی پڑگئی کہ ہم کو بے خبری میں رکھ کر اِتنا بڑا دھچکا دے گئے۔ ہم سے اِتنا بڑا دھوکا! بہت اُدھم مچائے رکھا' بہت شور وغوغا کیے رہے جب تک جیتے رہے۔ جاتی بار اِس قدر خاموشی سے چل دیئے..... آہ بابا! آہ!''

صائمہ بی بی بری طرح رو رہی تھی۔ مگر یہ کیا! اُس کی آنکھوں کے چشمے جیسے صدیوں سے خشک ہوئے پڑے ہوں۔ باوجود کوشش کے اُس کی آنکھوں سے ایک آنسو تک نہیں ٹپک رہا تھا۔ یقیناً یہ گہرے صدمے کا خمیازہ تھا جو اُسے بھگتنا پڑ رہا تھا۔ وہ بِنا آنسوؤں کے دِل سے روئے اور پچھتائے جا رہی تھی۔

''اب یہ وجود ہمیں کبھی نظر نہیں آئے گا۔ اب کوئی گلہ نہیں کرے گا۔ اب کوئی ہم سے کچھ فرمائش نہیں کرے گا۔ کوئی شکایت نہیں کرے گا۔ اب کوئی اپنی موجودگی کا احساس نہیں دِلائے گا.........''

بابا کے فوت ہوتے ہی بابا کا وجود ایک دم سے اُس کے لیے ایک معتبر اور

عزیز ہستی بن گیا تھا۔''مگر اب کیا ہوسکتا تھا........؟ بابا تو آناً فاناً چھن گئے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

''اب صائمہ بی بی اپنے تصوّر ہی میں اکثر اپنے سفید ریش بابا کی بڑے خلوص سے دیکھ ریکھ کرتی ہے۔ اُن کے ہر حکم پر فوری عمل پیرا ہوتی ہے۔اُن کے بڑھاپے اور نقاہت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اُن کے لئے نرم اور غذائیت سے بھر پور کھانا بناتی ہے۔ کپڑے بہت میلے ہونے سے پہلے ہی دھو دھا کر اِستری کر کے اُن کے سر ہانے رکھتی ہے۔اُٹھتے بیٹھتے اُن کی صحت کی خبر لیتی ہے۔اُن کی ضرورت اور کھانے پینے کی ڈھیروں چیزیں بِنا مانگے اُن کے پاس رکھتی ہے —— اور جب اِس تصوّر سے حقیقت کا تصادم ہوتا ہے تو صائمہ بی بی کو ہاتھ مَلتے ہی بنتی ہے۔

''کاش! وہ یہ سب کچھ بابا کے جیتے جی کر پاتی۔''

یہ خیال اکثر اُسے رُلا دیتا ہے کہ اب اُس کے گھر میں کسی سفید ریش بزرگ ہستی کا وجود نہیں ہے۔ پچھتاوے کے احساسات سے دوچار ہونے کے بعد صائمہ بی بی نے فوری طور پر اپنے لئے ایک سزا تجویز کی۔

''اپنے سفید ریش بابا کے چھن جانے کے غم میں کم از کم مجھے آج کی یہ چائے تو اب نہیں پینی چاہیے۔'' اُس نے جلدی سے چائے کی پیالی، جس کی بھاپ اب کم بلکہ ختم ہو چکی تھی، اُٹھائی اور باہر بارش میں بہادی۔

سردیوں کی پہلی اور دھیمی بارش جاری تھی۔ کوئلے دہک رہے تھے۔ موسم کی خوشگواریت، جسے چند لمحے پہلے تک اُس نے شدّت سے محسوس کیا تھا، اب زائل تھی۔ اب وہ سردی اور گرمی کے احساسات سے بے نیاز تھی۔ اگر احساس تھا تو محض ایک پچھتاوے کا۔ اپنے گھر سے اُس بزرگ ہستی کے چھن جانے کا، جس کی جیتے جی وہ خاطر خواہ خدمت نہیں کر سکی تھی اور جس کا لوٹ کے آنا اب ناممکن تھا۔

ooo

وہ آئے تو سہی

یونہی بیٹھے بیٹھے، ہتھیلی پہ سر ٹیکے، فرش کو گھورتے گھورتے ایک جانی پہچانی ہوک سی اُس کے سینے میں اُٹھی۔ وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے ذرا سی بڑبڑائی۔

''آہ! وہ وقت لوٹ آئے۔ صرف ایک بار لوٹ کے آجائے۔ میں نے اُس وقت جو بھول کی تھی، اب اُس سے باز رہوں مگر ایسا کبھی ہوا ہے کیا؟ آہ! میں کتنی نادان نکلی۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا میں نے۔ اپنا مقام، اپنا وقار اور سب کچھ گنوا کر آخر میں نے کیا پایا۔ یہی نا، روز روز کی نت نئی سوچیں اور آہیں اپنا مقدر بنالیں!''

''اپنے بیٹے کی شادی کی خوشی میں بھی یہ آدمی مجھے نیا جوڑا نہ پہنا سکا۔ اب اِس سے اور کیا اُمید کی جاسکتی ہے اور میں نے اِس کی خاطر کیا کیا نہ کِیا۔ اپنے بچوں کی ناراضگی مول لی، اُن کا دِل دُکھایا، بھری برادری میں اُنہیں شرمندہ کیا۔ بھلا جوان ہوتے بچوں کی ماں کو کیا ضرورت تھی دُوسرا نکاح کرنے کی!''

''مگر ضرورت تھی۔ بچوں کو سہارا چاہیے تھا۔ مجھے سائبان چاہیے تھا مگر..... مگر یہ کیسا سائبان نکلا؟ میرے بچے اب اِس کے بھی تو بچے ہوئے نا۔ اِس نے کیا دیا ہے اور کیا کِیا ہے میرے بچوں کے لئے اور مجھے کیا دیا، خاک۔ نکاح کے وقت دو جوڑے اور کانچ کی چوڑیاں اور لاکھ بھر کی رقم خوشی خوشی مہر مقرر کر دی مگر ہتھیلی پہ پھوٹی کوڑی بھی نہ رکھی۔

کتنا مکّار نکلا ہے مگر آج بھی کتنا پیار جتاتا ہے۔ آجائے تو دِن بھر پاس بیٹھا رہتا ہے۔ باتوں سے تھکتا نہیں ہے۔ کچھ مانگو تو ہنس کے ٹال دیتا ہے یا پھر غضب ناک

ہو جاتا ہے۔ جلی کٹی سنانے لگتا ہے۔

اُس وقت تو کیسے کیسے خواب دِکھاتا تھا۔ میرے لئے الگ سے گھر بنوانا چاہتا تھا۔ آسمان سے تارے توڑ کے لانے کی باتیں کرتا تھا۔ میرے بچوں کا مستقبل سنوارنے کی باتیں کرتا تھا۔

پڑوس میں ہونے کی وجہ سے صبح وشام میرے گھر میں آدھمکتا تھا۔ ڈیرا ہی جما لیتا تھا۔ کیا کیا ہمدردیاں جتاتا تھا۔ پاؤں پڑتا تھا۔ پتھر ہوتا تو وہ بھی پگھل جاتا۔ میں تو اِنسان تھی۔ اُس کی چکنی چوپڑی باتوں میں آگئی۔ زیادہ پانے کی تمنا کر بیٹھی......"

"اور میرے بیٹے' بیٹیاں! اللہ اُنہیں سلامت رکھے۔ کتنے اچھے ہیں۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ مجھے اب تک اپنے گھر میں جگہ دئے ہوئے ہیں۔ آج اگر مجھے گھر سے نکال دیں تو کیا یہ شخص مجھے اپنے گھر میں جگہ دے گا؟ ہرگز نہیں۔ میں اِس کی بیوی تب تک ہی ہوں جب تک اپنے بچوں کے گھر سے کھاتی ہوں اور ساتھ اِسے بھی کھلاتی ہوں۔

"آہ! بچوں کو پالنے کی خاطر شوہر کیا' اب اُلٹا اِسے پال رہی ہوں......"

اپنے بچوں سے چھپا چھپا کر آج تک میں نے کتنا کھلایا پلایا ہے اِس کو تاکہ یہ خوش رہے۔ اِس میں اپنائیت کا کچھ احساس جاگے مگر اِس نے میرے گھر سے' میرے یتیم بچوں کے گھر سے کھانا پینا اپنا حق سمجھ رکھا ہے۔ لالچی کہیں کا!

"پُرانا ملازم ہے۔ بڑے فخر سے کہتا ہے "دس ہزار روپے تنخواہ لیتا ہوں۔ میں کوئی عام اِنسان نہیں ہوں۔" خود کو مُلک کا گورنر سمجھتا ہے مگر مجھے دیتا کیا ہے۔ اُلٹا مہر بخشوانے کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اپنے مقصد میں کتنا پورا ہے۔ ہوں' ہوں' ہوں' نہیں! نہیں! مجھے رونا نہیں ہے۔ مجھے آنسو نہیں نکالنے ہیں۔ کوئی دیکھ لے گا۔ چوری پکڑ لے گا۔ پوچھ بیٹھے گا "یہ آنسو کیوں؟"

مجھے یہ بھی تو دِکھانا ہے کہ میں بیوہ سے سہاگن بنی ہوں اور کامیاب زندگی جی

رہی ہوں۔ مجھے آنسو پینے ہیں۔ اندر ہی اندر سسکتے اور سلگتے رہنا ہے۔ آہ! اِس خود غرض نے تو مجھے ایسے جال میں پھنسایا ہے کہ میں تڑپ بھی نہیں سکتی ہوں۔ کسی سے فریاد نہیں کر سکتی ہوں..........''

''میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ باپ کے ناتے نہ سہی' پڑوسی ہونے کے ناتے سے ہی یہ اُسے جہیز کے نام پر دو کوڑی کی چیز نہ دے سکا اور اپنی بیٹی کے جہیز میں ڈھیروں سامان ڈھو کے لایا ہے۔

میری ضرورتیں اِسے دِکھائی نہیں دیتی ہیں۔ میری اِلتجائیں اِسے قائل نہیں کر سکتی ہیں۔ تو پھر کیوں نہ میں اِس سے طلاق لے لوں لیکن ....لیکن کیا میں اپنے ماتھے پر یہ دو دو کلنک سہار پاؤں گی۔ پہلے بیوہ پھر طلاقن.....''

''نہیں' نہیں! میں سہار نہیں پاؤں گی۔ ورنہ اِسے کب اِنکار ہے۔ کھانے پینے کو کچھ مانگوں تو طلاق دینے جیسی ہی تو باتیں کر کے ڈرانے لگتا ہے.....''

خیالوں ہی خیالوں میں اُس کی نم آنکھیں الماری سے جا ٹکرائیں۔ ''تمہارا منہ بند ہی اچھا لگتا ہے.....'' دُکھتی کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ تیزی سے الماری پر جھپٹی اور اُس کے دونوں کُھلے ہوئے پٹ اِس زور سے بند کئے کہ الماری کی چولیں تک ہل گئیں۔

''اور سچ تو یہ ہے کہ منہ سب کا ہی بند رہے تو اچھا لگتا ہے اور اب کے میں بھی اپنا منہ بند رکھوں گی۔ بہت ہو چکا اب تک۔ صابن کی ایک ٹکیا اِس کے پاس سے نکلوانے کے لئے دس بار منہ کھولنا پڑتا ہے۔ اب اِس سے کچھ نہیں مانگوں گی اور اِسے کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ اب تک اِس سے جو مانگا' اِس نے کچھ دیا بھی ہے کیا؟ اِسے جو اچھا یا بُرا کہا' اُس کا اثر ہوا ہے کیا؟''

''اب میں اپنا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند رکھوں گی کہ منہ بند ہی اچھا لگتا ہے سب کا۔ صندوق کا' الماری کا' بچے کا' بوڑھے کا اور میرا بھی۔''

ہاں! مگر ابھی ایک سوال اِس سے پوچھ لوں جو ابھی میرے اُلجھے ذہن

میں گھس آیا ہے۔ جو چھ سالوں سے سوچ کی کٹھالی میں جلنے کے بعد آج پہلی بار میرے ذہن میں در آیا ہے۔

ایک آخری سوال اور صرف ایک ہی بار اور پھر اپنا منہ سی لوں گی۔ پھر سب کچھ اُسی طرح چلتا رہے گا' جیسے وہ چاہے گا۔ گو جانتی ہوں وہ کوئی جواب نہیں دے پائے گا۔ بلکہ اِس کے پاس کوئی جوازیت ہے ہی نہیں۔ بس حسبِ عادت ہنس کے ٹال دے گا یا پھر کوئی ایسی جلی کٹی بات کہہ دے گا کہ تن بدن میں آگ ہی لگ جائے گی۔

ہاں! اب کی بار وہ آئے تو میں اُسے یہ ضرور پوچھوں گی کہ مجھے دینے کے لئے تمہارے پاس کچھ نہیں تھا تو تم نے دُوسری شادی آخر کی ہی کس لئے؟ صرف یہ دِکھانے کے لئے کہ تم دو بیویوں کے شوہر ہو؟''

ہاں! اب کی بار وہ آئے تو سہی!

اپنی اِس سادہ سی سوچ پر اب وہ آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

○○○

رہی ہوں۔ مجھے آنسو پینے ہیں۔ اندر ہی اندر سسکتے اور سلگتے رہنا ہے۔ آہ! اس خودغرض نے تو مجھے ایسے جال میں پھنسایا ہے کہ میں تڑپ بھی نہیں سکتی ہوں۔ کسی سے فریاد نہیں کر سکتی ہوں.........."

"میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ باپ کے ناتے نہ سہی، پڑوسی ہونے کے ناتے سے ہی یہ اُسے جہیز کے نام پر دو کوڑی کی چیز نہ دے سکا اور اپنی بیٹی کے جہیز میں ڈھیروں سامان ڈھو کے لایا ہے۔

میری ضرورتیں اِسے دِکھائی نہیں دیتی ہیں۔ میری اِلتجائیں اِسے قائل نہیں کر سکتی ہیں۔ تو پھر کیوں نہ میں اِس سے طلاق لے لوں لیکن ....لیکن کیا میں اپنے ماتھے پر یہ دو دو کلنک سہار پاؤں گی۔ پہلے بیوہ پھر طلاقن....."

"نہیں، نہیں! میں سہار نہیں پاؤں گی۔ ورنہ اِسے کب اِنکار ہے۔ کھانے پینے کو کچھ مانگوں تو طلاق دینے جیسی ہی تو باتیں کر کے ڈرانے لگتا ہے....."

خیالوں ہی خیالوں میں اُس کی نم آنکھیں الماری سے جاٹکرائیں۔ "تمہارا منہ بند ہی اچھا لگتا ہے....." دُکھتی کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ تیزی سے الماری پر جھپٹی اور اُس کے دونوں کُھلے ہوئے پٹ اِس زور سے بند کئے کہ الماری کی چولیں تک ہل گئیں۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ منہ سب کا ہی بند رہے تو اچھا لگتا ہے اور اب کے میں بھی اپنا منہ بند رکھوں گی۔ بہت ہو چکا اب تک۔ صابن کی ایک ٹکیا اِس کے پاس سے نکلوانے کے لئے دس بار منہ کھولنا پڑتا ہے۔ اب اِس سے کچھ نہیں مانگوں گی اور اِسے کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ اب تک اِس سے جو مانگا، اِس نے کچھ دیا بھی ہے کیا؟ اِسے جو اچھا یا بُرا کہا، اُس کا اثر ہوا ہے کیا؟"

"اب میں اپنا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند رکھوں گی کہ منہ بند ہی اچھا لگتا ہے سب کا۔ صندوق کا، الماری کا، بچے کا، بوڑھے کا اور میرا بھی۔"

ہاں! مگر ابھی ایک سوال اِس سے پوچھ لوں جو ابھی میرے اُلجھے ذہن

میں گھس آیا ہے۔ جو چھ سالوں سے سوچ کی کھٹی میں جلنے کے بعد آج پہلی بار میرے ذہن میں در آیا ہے۔

ایک آخری سوال اور صرف ایک ہی بار اور پھر اپنا منہ سی لوں گی۔ پھر سب کچھ اُسی طرح چلتا رہے گا، جیسے وہ چاہے گا۔ گو جانتی ہوں وہ کوئی جواب نہیں دے پائے گا۔ بلکہ اِس کے پاس کوئی جوازیت ہے ہی نہیں۔ بس حسبِ عادت ہنس کے ٹال دے گا یا پھر کوئی ایسی جلی کٹی بات کہہ دے گا کہ تن بدن میں آگ ہی لگ جائے گی۔

ہاں! اب کی بار وہ آئے تو میں اُسے یہ ضرور پوچھوں گی کہ مجھے دینے کے لئے تمہارے پاس کچھ نہیں تھا تو تم نے دُوسری شادی آخر کی ہی کس لئے؟ صرف یہ دِکھانے کے لئے کہ تم دو بیویوں کے شوہر ہو؟''

ہاں! اب کی بار وہ آئے تو سہی!

اپنی اِس سادہ سی سوچ پر اب وہ آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

○○○

دھماکا

دھماکا اگرچہ کچھ دُوری پر ہوا تھا مگر آس پاس کی بستیوں کے دِل دہل گئے تھے۔

دھماکا کیسا ہی ہو۔ چھوٹا یا بڑا۔ دھماکے میں کچھ نقصان ہو یا نہ ہو اور دھماکے کا محرّک کوئی بھی ہو مگر آس پاس کی بستیوں کو اِس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ ریاستی عوام کو اِس حقیقت کا گزشتہ کئی برسوں سے مشاہدہ اور تجربہ ہے۔

معروف احمد کا گھر گھنی بستی سے کچھ فاصلے پر واقع تھا اور تنہا تھا۔ لگ بھگ بیس گز کی دُوری پر اُن کے بھائی کا گھر بھی آباد تھا۔ علاقے میں دہشت پسندانہ کارروائیوں کے باعث گھنی بستی میں بارہا تلاشیاں ہوئیں اور بہت سے باعزت اور شریف لوگ فوجیوں کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں کا شکار ہو کر، اپنے آس پاس والوں میں نہ صرف چرچا کا باعث بنے بلکہ عام لوگوں کی نظروں میں قصور وار ٹھہر کر رُسوائی اور جگ ہنسائی کا موجب بھی بنے مگر معروف احمد باعزت رہے اور اِس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ وہ سچے محبِ وطن ہیں اور اُن کے دل میں کسی طرح کا کوئی کھوٹ نہیں ہے۔

معروف احمد کا شمار گاؤں کے گنے چنے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ گاؤں بھر کے لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہ بھی اور لوگوں کی طرح فوجیوں کے ہاتھوں پٹ پٹا کر چرچا کا باعث بنیں۔ اپنے آس پاس رہنے والے لوگوں کی نظروں میں کم حیثیت ہو کر رہ جائیں اور لوگ اُن کے حوالے

دے دے کر آپس میں باتیں کریں۔ اِس لئے وہ بہت محتاط اور دل ہی دل میں فکر مند بھی رہا کرتے تھے۔ اِدھر جب سے گاؤں کے ایک ڈاکٹر صاحب فوجیوں کے ہاتھوں بے آبرو ہوئے تھے، معروف احمد اور بھی تشویش میں پڑ گئے تھے مگر اسلحہ سے لیس منہ زور فوجیوں کو کسی کی ذاتی تشویش اور پرابلم سے کیا لینا دینا تھا۔

معروف احمد کے گھر میں بھی کئی بار چیکنگ اور تلاشیاں ہوئیں اور خیر سے بخیر و خوبی گزر گئیں۔ اُن کے گاؤں میں جب فوجی چوکیاں چپے چپے پر لگنے لگیں تو فوجیوں نے اچھے اچھے معززین کو بھی اپنا مال و اسباب اُٹھوانے اور دُوسری جگہ تک لے جانے سے نہیں بخشا مگر معروف احمد فوجیوں کی بار برداری سے بھی بچے رہے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ فوجیوں کے کام آنے سے گریز کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ فوجی زِندگی اور فوجی پیشے کو سیلوٹ کرتے تھے۔ وہ فوجیوں کے دِل و جان سے خیر خواہ تھے اور کل تک اُنہیں بھی اپنا خیر خواہ سمجھتے تھے مگر گزشتہ کچھ عرصہ سے اُن کے علاقے میں فوجیوں کے ہاتھوں کچھ ایسے حالات اور واقعات ظہور پذیر ہو چکے تھے جن کی وجہ سے معروف احمد فوجیوں سے دِل برداشتہ ہو گئے تھے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ اُنہیں فوجیوں کا اندازِ تخاطب اور تحکمانہ لب و لہجہ قطعی پسند نہیں تھا۔ اُنہیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ فوجی جب گھروں میں تلاشی لیں تو اپنے سے بڑی عمر اور بڑا عہدہ رکھنے والے کو بھی نہ صرف 'تُو' سے نوازیں بلکہ دھکّا مکّا بھی کر دیں۔ بندوق کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں اگر چھڑی ہو تو اُسے بھی بروئے کار لا بیٹھیں۔ عام اور پُرسکون حالات میں بھی، امیر اور غریب سب سے بنا اُجرت دئے، بندوق کی نوک پر، کسی کی مجبوری اور معذوری کو نظر انداز کرتے ہوئے، اپنا سامان اُٹھوائیں۔ اپنے کسی بھی کام کے لئے آتی جاتی بسوں سے مسافروں کو اُتار لیں۔ پرانگر کے مقام پر ہونے والی ہلاکتیں آج بھی کسی کو بھی رُلا دینے کے لئے کافی تھیں، جب فوجیوں نے آتی جاتی مسافر بسوں سے درجنوں سِول لوگوں کو اُتار کر اپنے ساتھ لیا اور اُنہیں ڈھال

کے طور پر اِستعمال کرتے ہوئے علاقے میں چھپے دہشت پسندوں کا گھیراؤ کیا اور سِول لوگوں کو ڈھال بنا کر دہشت پسندوں پر فائرنگ کی۔ نتیجے میں دہشت پسندوں سے دُگنی تعداد میں وہ بے گناہ اور معصوم لوگ، جو صبح اپنے اپنے گھروں سے اپنے مختلف کاموں کے لئے نکلے تھے، آناً فاناً ہی موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ مارے جانے والے اُن بے گناہوں میں بائیس سالہ وہ خوبرو نوجوان بھی شامل تھا جو اپنے والدین کی واحد اولاد تھا، جس کی شادی کے دعوت نامے بانٹے جا چکے تھے، جس کے ماں باپ اُسے کچھ ہی دِنوں میں دُولہے کے رُوپ میں دیکھنے کی تیاریوں میں جُٹے تھے۔ بھلا کوئی اُن کے غم کا اندازہ کر سکتا ہے۔

جب تازہ دھماکا ہوا تو صرف معروف احمد کو ہی نہیں بلکہ سب بستی والوں کو اِسی طرح کے درجنوں گزشتہ واقعات اور حادثات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ ''ہائے! اب کیا کریں۔ کہاں بھاگیں، کیسے بچیں، اپنے وجود کو کیسے اوجھل کریں۔ نہ جانے آج ہم میں سے کس کس کی باری آتی ہے؟''

غرض یہ کہ ہر کوئی دہشت زدہ تھا۔ معصوم بچے بھی خوف اور دہشت سے دو چار ہو گئے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گھروں میں ہو رہی اُتھل پتھل اور بھاگ دوڑ کو دیکھ رہے تھے۔ معروف احمد اپنے گھر میں لرزہ براندام تھے۔ اُنہیں اِس بات سے وحشت ہو رہی تھی کہ آج وہ بھی دُوسرے لوگوں کی طرح رُسوا ہو کر ہی رہیں گے۔ ''کاش وہ آج گھر میں رہنے کے بجائے معمول کی طرح شہر ہی چلے گئے ہوتے۔'' وہ خود کو کوسے جا رہے تھے اور سوچے جا رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں تو ایک طرف بِنا دیکھے ہی دھماکے کی زد میں آئے زخمی اور تڑپتے فوجیوں کا دردناک منظر تھا، تو دُوسری طرف فوجیوں کے ہاتھوں ہی اپنی پٹائی اور رُسوائی کا، اور اِس پٹائی اور رُسوائی کا سیدھا سیدھا یہی مطلب تھا کہ اپنے جاننے والوں اور آس پاس کے رہنے والوں کی نظروں میں قصوروار، کم تر اور کم رُتبہ ہو کر رہ جانا۔ مگر وہ اِس رُسوائی سے ہر حال میں بچے رہنا

چاہتے تھے۔ اِس لئے اب شدید بحران سے بچنا چاہتے تھے۔

اُنہوں نے دھماکے کرنے والوں کو بُڑ بُڑا کر بُرا بھلا کہا اور بددُعائیں دیں۔ اُسی وقت اُنہیں آنکھوں دیکھی تازہ ترین رپورٹ ملی کہ فوجی گاڑی گزر جانے کے بعد دھماکا ہوا ہے اور فوجیوں کا رائی برابر بھی نقصان نہیں ہوا ہے لیکن وہاں سے گزر رہے لوگوں کی چیخیں اور دُہائیاں نکل رہی ہیں۔ فوجی دونوں ہاتھوں سے راہ چلتے لوگوں کی پٹائی کر رہے ہیں۔

اِس رپورٹ سے معروف احمد کو قدرے راحت ملی۔ وہ اپنے گھر والوں سے مخاطب ہوئے۔ ''فوجیوں کا کچھ بھی نقصان نہ ہونے کا مطلب ہے ہم سِول لوگوں کا کم سے کم نقصان۔ ممکن ہے فوجی بھائیوں کا سارے کا سارا غصہ قریب کے لوگوں پر ہی ختم ہو جائے اور وہ ہمارے ہاں تک آنے کی زحمت نہ کریں۔''

مگر اُسی وقت اُن کے ایک بھاری بھر کم دوست دوڑتے اور ہانپتے ہوئے آئے اور بجھتی ہوئی آگ کو سارے گھر میں بھڑکا کر چلتے بنے۔ بیگم معروف تو اُنہیں آتا دیکھ کر یہ سمجھیں کہ ہمارے گھر آ رہے ہیں۔ کچھ تو ہماری دہشت کم ہوگی مگر اُنہوں نے دُور سے ہی پھٹی آواز میں ہانک لگائی۔ ''بدبختو! ابھی گھر میں ہی پڑے ہو۔ جان کی امان چاہتے ہو تو بھاگ نکلو۔ فوجی نیچے کے لوگوں کو اَدھ موا کرتے ہوئے یہ میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔'' وہ خوف سے گرتے سنبھلتے آنگن میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

معروف احمد اور اُن کی بیگم اُس وقت برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ معروف احمد نے آوَ دیکھا نہ تاوَ دیکھا اور نہ ہی پیچھے مڑ کے اپنی بیگم کو دیکھا۔ وہ وہیں سے نہایت پھرتی سے اپنے دوست کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

سانڈ جیسے ہٹے کٹے دونوں آدمیوں کو خوفزدہ حالت میں بھاگتے دیکھ کر لاکھ خوف کے باوجود بیگم معروف دِل ہی دِل میں ہنس پڑیں۔ اُنہیں افسوس بھی ہوا کہ

معروف احمد اپنی ہی جان لے کر بھاگ کھڑے ہوئے بچوں کی خبر تک نہیں لی۔ یہ کیسی اُفتاد آن پڑی ہے۔ بوکھلا کر وہ بھی سارے گھر میں اندر اور باہر بھاگ دوڑ کر کے گرنے اور سنبھلنے لگیں۔

پہلے تو اُنہوں نے بڑے بیٹے کے کمرے میں جا کر اُسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے باہر کیا۔ وہ آئے دِنوں کی اِس طرح کی بھاگم دوڑ سے تنگ آ کر آج گھر میں ٹکے رہنے پر بضد تھا۔ اِدھر دیور بھائی اور اُس کے گھر والوں کو ہانک لگائی۔

''بھئی اب نکل بھاگو۔ ارے مجھے بھی آنے دو۔ ایک ساتھ ہی کسی ایک طرف کا رُخ کریں گے۔''

منجھلے بیٹے اور بیٹی کو بھی گھر سے نکل بھاگنے کو کہا اور خود بڑے کمرے کی طرف لپکیں کہ صندوق سے زیور کا ڈبہ اور روپیہ وغیرہ ساتھ میں لے لوں مگر صندوق تک پہنچتے پہنچتے دو بار فرش پر گر پڑیں۔ بیٹے نے مشورہ دیا ''ماں! رہنے دو۔ اِس وقت جان بچاؤ۔'' وہ صندوق کا خیال ترک کر کے چپلوں کی طرف متوجہ ہوئیں کہ ننگے پاؤں بھاگا نہیں جا سکے گا مگر چار جوڑے چپلوں میں سے ایک بھی جوڑا نظر نہ آیا۔ مجبوراً ننگے پاؤں نکلنے کا اِرادہ کیا۔ ایک قدم باہر بڑھاتے ہوئے بولیں ''اللہ رے! اور کچھ نہیں تو بڑے کمرے کو کنڈی ہی چڑھا دُوں۔'' جلدی سے اندر کو لپکیں اور بڑے کمرے کے دروازے پہ آ کر دھڑام سے گر پڑیں۔ بیٹا دوڑ کر پاس آیا اور کہا ''ماں آپ چلو۔ میں خود کنڈی چڑھا کر آتا ہوں۔'' اُنہوں نے بارہ سالہ بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور دیور بھائی کے گھر کی طرف رُخ کیا جو کہ لگ بھگ بیس گز کے ہی فاصلے پر تھا مگر نصف میں ہی پہنچ کر پھر سے گر پڑیں۔ آگ بگولہ ہوئے فوجیوں کا سر پہ آن پہنچنے کا ڈر تھا۔ جلدی سے اُٹھیں اور بڑ بڑائیں ''اللہ رے! کہتے ہیں ۱۹۴۷ء میں لوگ ہجرت کر کے پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان چلے گئے تھے اور میں، میں اپنے گھر سے دیور بھائی کے گھر تک نہیں پہنچ پا رہی ہوں۔ اب کے میں اور کتنی دُور بھاگ سکوں گی؟''

گھر کے قریب پہنچتے ہی اُنھوں نے دیورانی کو آواز لگائی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ سارا گھر کھلا پڑا تھا اور اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ''اوہ! یہ بھی معروف احمد کی طرح مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔'' اُنہوں نے ایک خشک آہ بھری۔ ''اب کیا کیا جائے؟ کہاں اور کیسے بھاگا جائے؟''

اُن کا دِل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کہیں دُور پار بھاگنے کی ہمت نہ جٹا کر وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی چھت پر چڑھ گئیں اور حفاظتی دیوار کی آڑ میں ماں بیٹی دونوں لیٹ گئیں۔ اب یہ فوجیوں پر ہی منحصر تھا کہ چاہے وہ مار پٹائی کریں، چاہے ترس کھا کر چھوڑ دیں۔ گھنٹہ بھر اِسی حالت میں گزر گیا۔ تب اُن کے کانوں میں کچھ آوازیں سنائی دیں۔ دِل زوروں سے دھڑک اُٹھا کہ اب فوجی آن پہنچے۔ مگر جلدی ہی سمجھ میں آیا کہ بستی کے لوگوں اور بچوں کی آوازیں ہیں جو اب اپنے گھروں میں واپس آ رہے ہیں۔ وہ آہستہ سے اُٹھیں اور گھر کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ایک اجنبی آدمی گھر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اُس سے پوچھا ''بھائی! تم نے اِدھر کہیں فوجی دیکھے کیا؟'' اُس نے اطمینان سے کہا ''جی نہیں، وہ نیچے سڑک میں ہیں۔''

''کہیں اِدھر تو نہیں آ رہے ہیں؟'' بیگم معروف نے پھر پوچھا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔'' اُس نے یقین دلایا۔

اب دِن ڈھل چکا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ اِس لئے یہ یقین بھی ہوتا جا رہا تھا کہ اب رات ہونے کی وجہ سے فوجی گاؤں میں نہیں گھسیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں گھروں سے بھاگے ہوئے افراد تاک جھانک کرتے ہوئے ایک ایک کر کے گھر میں واپس آتے گئے مگر معروف احمد واپس نہ آئے۔ سب کو تشویش ہونے لگی۔ بیگم معروف نے کہا ''اللہ رے! بہت ڈرتے تھے۔ کہیں بھاگ دوڑ کرتے ہوئے خود ہی فوجیوں کے ہاتھ نہ جا لگے ہوں۔''

معروف احمد اپنی ہی جان لے کر بھاگ کھڑے ہوئے بچوں کی خبر تک نہیں لی۔ یہ کیسی اُفتاد آن پڑی ہے۔ بوکھلا کر وہ بھی سارے گھر میں اندر اور باہر بھاگ دوڑ کر کے گرنے اور سنبھلنے لگیں۔

پہلے تو اُنہوں نے بڑے بیٹے کے کمرے میں جا کر اُسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے باہر کیا۔ وہ آئے دِنوں کی اِس طرح کی بھاگم دوڑ سے تنگ آ کر آج گھر میں ٹکے رہنے پر بضد تھا۔ اِدھر دیور بھائی اور اُس کے گھر والوں کو ہانک لگائی۔

''بھئی اب نکل بھاگو۔ ارے مجھے بھی آنے دو۔ ایک ساتھ ہی کسی ایک طرف کا رُخ کریں گے۔''

منجھلے بیٹے اور بیٹی کو بھی گھر سے نکل بھاگنے کو کہا اور خود بڑے کمرے کی طرف لپکیں کہ صندوق سے زیور کا ڈبہ اور روپیہ وغیرہ ساتھ میں لے لوں مگر صندوق تک پہنچتے پہنچتے دو بار فرش پر گر پڑیں۔ بیٹے نے مشورہ دیا ''ماں! رہنے دو۔ اِس وقت جان بچاؤ۔'' وہ صندوق کا خیال ترک کر کے چپلوں کی طرف متوجہ ہوئیں کہ ننگے پاؤں بھاگا نہیں جا سکے گا مگر چار جوڑے چپلوں میں سے ایک بھی جوڑا نظر نہ آیا۔ مجبوراً ننگے پاؤں نکلنے کا اِرادہ کیا۔ ایک قدم باہر بڑھاتے ہوئے بولیں ''اللہ رے! اور کچھ نہیں تو بڑے کمرے کو کنڈی ہی چڑھا دُوں۔'' جلدی سے اندر کو لپکیں اور بڑے کمرے کے دروازے پہ آ کر دھڑام سے گر پڑیں۔ بیٹا دوڑ کر پاس آیا اور کہا ''ماں آپ چلو۔ میں خود کنڈی چڑھا کر آتا ہوں۔'' اُنہوں نے بارہ سالہ بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور دیور بھائی کے گھر کی طرف رُخ کیا جو کہ لگ بھگ بیس گز کے ہی فاصلے پر تھا مگر نصف میں ہی پہنچ کر پھر سے گر پڑیں۔ آگ بگولہ ہوئے فوجیوں کا سر پہ آن پہنچنے کا ڈر تھا۔ جلدی سے اُٹھیں اور بڑ بڑائیں ''اللہ رے! کہتے ہیں ۱۹۴۷ء میں لوگ ہجرت کر کے پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان چلے گئے تھے اور میں، میں اپنے گھر سے دیور بھائی کے گھر تک نہیں پہنچ پا رہی ہوں۔ اب کے میں اور کتنی دُور بھاگ سکوں گی؟''

گھر کے قریب پہنچتے ہی اُنھوں نے دیورانی کو آواز لگائی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ سارا گھر کھلا پڑا تھا اور اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ''اوہ! یہ بھی معروف احمد کی طرح مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔'' اُنہوں نے ایک خشک آہ بھری۔ ''اب کیا کیا جائے؟ کہاں اور کیسے بھاگا جائے؟''

اُن کا دِل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کہیں دُور پار بھاگنے کی ہمت نہ جٹا کر وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی چھت پر چڑھ گئیں اور حفاظتی دیوار کی آڑ میں ماں بیٹی دونوں لیٹ گئیں۔ اب یہ فوجیوں پر ہی منحصر تھا کہ چاہے وہ مار پٹائی کریں' چاہے ترس کھا کر چھوڑ دیں۔ گھنٹہ بھر اِسی حالت میں گزر گیا۔ تب اُن کے کانوں میں کچھ آوازیں سنائی دیں۔ دِل زوروں سے دھڑک اُٹھا کہ اب فوجی آن پہنچے۔ مگر جلدی ہی سمجھ میں آیا کہ بستی کے لوگوں اور بچوں کی آوازیں ہیں جو اب اپنے گھروں میں واپس آ رہے ہیں۔ وہ آہستہ سے اُٹھیں اور گھر کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ایک اجنبی آدمی گھر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اُس سے پوچھا ''بھائی! تم نے اِدھر کہیں فوجی دیکھے کیا؟'' اُس نے اطمینان سے کہا ''جی نہیں' وہ نیچے سڑک میں ہیں۔''

''کہیں اِدھر تو نہیں آ رہے ہیں؟'' بیگم معروف نے پھر پوچھا۔

''نہیں' بالکل نہیں۔'' اُس نے یقین دلایا۔

اب دِن ڈھل چکا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ اِس لئے یہ یقین بھی ہوتا جا رہا تھا کہ اب رات ہونے کی وجہ سے فوجی گاؤں میں نہیں گھسیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں گھروں سے بھاگے ہوئے افراد تاک جھانک کرتے ہوئے ایک ایک کر کے گھر میں واپس آتے گئے مگر معروف احمد واپس نہ آئے۔ سب کو تشویش ہونے لگی۔ بیگم معروف نے کہا ''اللہ رے! بہت ڈرتے تھے۔ کہیں بھاگ دوڑ کرتے ہوئے خود ہی فوجیوں کے ہاتھ نہ جا لگے ہوں۔''

مگر شام کی تاریکی گہری ہونے سے قبل ہی وہ لگ بھگ دھڑ گھسیٹتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور بتایا کہ گر پڑنے سے ٹانگوں اور کمر میں سخت چوٹیں آئی ہیں۔ اب چونکہ رات تھی اور باہر کے حالات خطرناک' لہٰذا ہائے ہائے کرتے ہوئے رات گھر ہی میں گزارنی پڑی۔ دونوں گھروں سے بھاگ دوڑ کرنے والے چھوٹے بڑے سب ہی لوگوں کو شدید جسم درد اور بخار نے جکڑ لیا تھا۔ صبح ہوئی تو معروف احمد لڑکھڑاتے قدموں سے ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے اور جب وہ علاج معالجہ کروانے کے بعد گھر لوٹے تو اُس وقت انہیں گہرا دھکا لگا جب آس پاس کے لوگ اُن کی خیریت معلوم کرنے کے لئے اُن کے گھر آ آ کر یہ پوچھنے اور مشورے دینے لگے کہ فوجیوں نے آپ کو کتنا' کہاں کہاں اور کیسے کیسے مارا؟ آپ اُن کے ہتھے کیسے چڑھ گئے؟ آپ گھر سے بھاگ کیوں نہیں نکلے تھے؟''

اب وہ کس طرح اور کس کس کو یہ یقین دِلاتے کہ فوجیوں نے اُن کا بال تک بیکا نہیں کیا ہے۔ فوجیوں نے تو صرف سڑک کے نزدیک رہنے والوں کی خبر لی تھی اور چلے گئے تھے۔ اب وہ کس کس کو یہ یقین دِلاتے کہ اصل میں بھاگ دوڑنے ہی تو اُن کا یہ حشر کیا ہے مگر اُن کی باتوں پر کون یقین کرتا —— سارے علاقے میں یہ بات پھیلتی جا رہی تھی کہ گاؤں کے سب سے معتبر اور باعزت شخص کو بھی فوجیوں نے لتاڑ کے رکھ دیا ہے اور یہ بات معروف احمد کی ذات کے لئے ایک اور تازہ دھماکے سے کسی بھی طرح کم نہ تھی۔

○○○

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ نگاری کے حوالے سے زنفر کھوکھر صاحبہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ پندرہ بیس برس سے مسلسل لکھ رہی ہیں اور اُردو کے نمائندہ رسالوں اور اخباروں میں قرینے سے چھپ رہی ہیں۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ قیاس پر حقیقت کا ملمع چڑھانے سے وہ گریز کرتی ہیں۔ اُن کی چشمِ بینا میں لگا ہوا کیمرہ اُنہی موضوعات پر کلک کرتا ہے جو موضوعات حقائق سے مملو ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری خود کو اُن کے افسانوں کے قریب محسوس کرتا ہے۔ کبھی کبھار قاری کو یوں لگتا ہے کہ مصنفہ نے وہ بات کہہ دی ہے جو اُس کے ساتھ بیت چکی ہے اور جسے اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اچھوتے موضوعات، چھوٹے چھوٹے واقعات، فکر انگیز لمحات، اندھیروں اُجالوں کی بارات اور ظریفی میں ڈوبے ہوئے تیروں کی سوغات کا برمحل اِستعمال کر کے زنفر کھوکھر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ افسانہ کہنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے اور کسی بھی فن میں کامیابی کا راز فن کار کے ''اپنے انداز'' ہی میں مضمر ہے۔

میرے خیال میں فکشن کے شعبے میں زنفر کھوکھر نے اِتنی منزلیں طے کر لی ہیں کہ توصیف و توقیر، عزت و شہرت اور انعام و اکرام کی صورت میں اُن کے فن کی پذیرائی کرنے میں یہ معاشرہ افتخار محسوس کر سکتا ہے۔

امین بنجارا

۲۶۷۔ جوگی گیٹ، جموں

۱۹/اپریل ۲۰۱۰ء